رجسٹرڈ ایل نمبر 7360

عدد ۵

ماہنامہ

میثاق

لاہور

•

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

•

دفتر رسالہ میثاق

رحمانپورہ اچھرہ - لاہور

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

سالانہ چندہ ۶ روپے

پاکستان کا مستقبل

از

سعید ملک

اس کتاب میں پاکستانی قوم کا تاریخی ارتقاء بیان کرکے قومی تعمیر و ترقی کے کام کا جائزہ جدید نظریات کی روشنی میں لیا گیا ہے - نیز قومی تعمیر کے ان نقشوں پر اصولی بحث کی گئی ہے جن پر عمل پیرا ہو کر مختلف قوموں نے ترقی کی ہے - اس کے علاوہ ان حلقوں کی خام خیالیوں کو واضح کیا گیا ہے جو فکری انقلاب سے گریز کی راہیں اختیار کرتے ہیں اور سطحی طریقوں سے اسلام اور مسلمان قوم کی ترقی کے قائل ہیں -

کتابت و طباعت اعلیٰ ٹائیٹل دیدہ زیب صفحات ۲۱۳

قیمت صرف تین روپے

ملنے کا پتہ

المکتبۃ الرحمانیہ اچھرہ ـــ لاہور

مکتبہ ... لاہور

پبلشرز • بک سیلرز

رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۶۰۶

ماہنامہ میثاق لاہور

★

فہرست مضامین

جلد ۱ | بابت ماہ اگست ۱۹۵۹ء ـ مطابق محرم الحرام ۱۳۷۹ھ | عدد ۳

تذکرہ و تبصرہ ــــــــــــ امین احسن اصلاحی ۲

تدبر قرآن

تفسیر سورہ بقرہ ــــــــــــ امین احسن اصلاحی ۹

تزکیۂ نفس

حج اور آفات حج ــــــــــــ امین احسن اصلاحی ۲۱

اسلامی قانون

اسلامی قانون کے ماخذ ــــــــــــ امین احسن اصلاحی ۲۹

سفر حج

پھر مکہ معظمہ میں ــــــــــــ امین احسن اصلاحی ۴۱

شذرات ــــــــــــ " ۵۵

★

محی الدین پرنٹر پبلشر نے الشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ میثاق ۱۱- احمد سٹریٹ ۱. رحمان پورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

حکمت عملی کے تحت شریعت میں ردّ و بدل کا جو نظریہ صاحب ترجمان القرآن نے ترجمان کے صفحات میں پیش کیا تھا اس پر ہماری مفصل تنقید مقام رسالت (کراچی) اور الفرقان (لکھنؤ) میں شائع ہو چکی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ تنقید میثاق کے اکثر قارئین کی نگاہوں سے بھی گذری ہوگی۔ اب ماہ جون ۱۹۵۹ء کے ترجمان میں ہماری اس "تنقید پر صاحب ترجمان القرآن کی تنقید" نکلی ہے جس میں جناب موصوف نے ہماری پیش کردہ معروضات کی خامیاں دکھائی ہیں اور ساتھ ہی اس امر کے کچھ مزید دلائل اکٹھے کیے ہیں کہ حضرات محدثین نے راویوں پر جو جرحیں فرمائی ہیں یہ بھی تو اسی غیبت میں داخل ہیں جو قرآن میں حرام قرار دی گئی ہے اور جس کو مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن حکمت عملی اور مصلحت کے تحت محدثین اور فقہا نے اس حرام کو حلال ٹھہرایا۔

ہم نے صاحب ترجمان القرآن کے اس نظریے پر جو ناچیز گذارشات پیش کی تھیں ان کے بارے میں صاحب ترجمان کا ارشاد یہ ہے کہ ہم نے "ذاتی بغض و عناد" کی بنا پر شرعی مسائل میں کھینچ تان کی ہے۔ ہماری درخواست یہ ہے کہ ہماری تنقید کا متعلق حصہ الفرقان یا مقام رسالت میں میثاق کے قارئین بھی ملاحظہ فرمالیں تاکہ وہ خود فیصلہ کر سکیں کہ ہم نے مسئلہ کی اصل حقیقت پیش کی ہے یا ذاتی بغض و عناد کی بنا پر ایک مسئلہ شرعی میں کھینچ تان کی ہے۔ صاحب ترجمان القرآن اس اعتبار سے انتہائی خوش قسمت آدمی معلوم ہوتے ہیں کہ آج تک جس نے بھی ان کے کسی مضمون یا ان کی کسی کتاب پر کوئی تنقید لکھی ہے "ذاتی بغض و عناد" کے تحت شرعی مسائل میں "کھینچ تان" ہی کی ہے "کسی نے بھی ان پر ایمان داری کے ساتھ تنقید نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ "تنقیدیں کرنے والے اپنے اعمال نامے سیاہ کرتے رہے ہیں" اور ادھر صاحب ترجمان کے دنیا اور آخرت دونوں میں مراتب پر مراتب بلند ہوتے رہے ہیں۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

ہم نے اپنے مضمون میں غیبت کی ایک جامع و مانع منطقی تعریف بھی کر دی تھی تاکہ اس تعریف کی روشنی میں صاحب ترجمان بھی غیبت اور جرح و تعدیل کے فرق کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور دوسرے لوگ بھی، جو دین کی زیادہ گہری سمجھ نہ رکھنے کے سبب سے غیبت اور غیر غیبت میں امتیاز نہیں کر پاتے، اس تعریف سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ تعریف ہماری طرف سے ایک ناچیز علمی و دینی خدمت تھی جس نے الحمد للہ اہل علم کی نگاہوں میں قدر کی جگہ پائی لیکن چونکہ ہماری پیش کردہ تعریف کی رو سے جرح و تعدیل کا کام غیبت سے خارج ہو جاتا ہے اور محدثین و فقہا غیبت کی تہمت سے بری ہو جاتے ہیں اس وجہ سے صاحب ترجمان کو ہماری اس تعریف پر بڑا غصہ آیا ہے کہ ہم نے غیبت کی ایک ایسی تعریف کیوں کر دی جس سے ان کے محبوب نظریہ کی واحد دلیل بالکل مجروح ہو کے رہ گئی ہے۔

موصوف کو اس بات پر اصرار ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث میں غیبت کی جو تعریف منقول ہوئی ہے وہی تعریف غیبت کی منطقی تعریف ہے، اس میں نہ کسی اضافے کی گنجائش ہے، نہ کسی کمی کی۔ موصوف فرماتے ہیں کہ اس میں کسی کمی بیشی کرنے کی جسارت کوئی مسلم تو درکنار کوئی غیر مسلم بھی نہیں کر سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غیبت کی کوئی منطقی تعریف جامع و مانع فرما دی ہے تو میں کسی غیر مسلم کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس باب میں کیا روش اختیار کرے گا لیکن ایک مسلم کے متعلق میرا حسن ظن یہی ہے کہ وہ اپنی طرف سے اس میں سے کچھ نکالنے یا اس میں کچھ داخل کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ کسی چیز کی جامع و مانع منطقی تعریف کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس نے اپنے اندر داخل ہونے والی تمام چیزوں کو سمیٹ لیا اور جو چیزیں اس سے خارج ہیں ان کے لیے اپنا دروازہ بند کر دیا۔ اب اگر کسی چیز کی جامع و مانع تعریف ہمارے حضورؐ فرما گئے ہیں تو اس کے جامع و مانع ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟ ہم آپ تو کیا دنیا کے لاکھوں ارسطو بھی اگر زور لگائیں تو وہ بھی اس کو اس کی جگہ سے ہلا نہیں سکتے۔

اب آئیے دیکھیے کہ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے غیبت کی کیا تعریف منقول ہوئی ہے اور اہل علم نے اس تعریف کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اپنی طرف سے اس مضمون میں کسی نئے مواد کا کوئی اضافہ نہیں کریں گے بلکہ دو تین مہینوں کی کاوش سے جو مواد صاحب ترجمان نے خود جمع فرما دیا ہے ہم اسی مواد کو سامنے رکھیں گے اور انھیں دعوت دیں گے کہ وہ اس مواد کا اخباری نقطہ نظر سے نہیں بلکہ علمی و تحقیقی نقطہ نظر سے جائزہ لیں۔ ان شاء اللہ اصل حقیقت ان کے سامنے آجائے گی اور اگر ہماری بدقسمتی سے ان کے

سامنے نہ آ سکی تو دوسرے غیر جانبدار اور حق پسند لوگوں کے سامنے تو انشاء اللہ آ ہی جائے گی ۔

صاحب ترجمان نے غیبت سے متعلق مندرجہ ذیل دو روایتیں نقل کی ہیں ۔ ہم ان کا بعینہ وہی ترجمہ یہاں دے رہے ہیں جو صاحب ترجمان کا اپنا کیا ہوا ہے ۔

حضرت ابوہریرہؓ کے حوالہ سے یہ روایت نقل ہوئی ہے ۔

" غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا ذکر ایسے طریقے سے کرے جو اس کو برا محسوس ہو ۔ عرض کیا گیا کہ حضور کا کیا خیال ہے اگر میرے بھائی میں واقعی وہ برائی موجود ہو ؟ فرمایا اگر اس میں وہ برائی ہو جس کا تو ذکر کر رہا ہے تو تو نے اس کی غیبت کی ۔ اور اگر اس میں وہ برائی موجود نہیں ہے جس کا تو نے ذکر کیا ہے تو تو نے اس پر بہتان لگایا ۔"

دوسری روایت مطلب بن عبداللہ سے ہے اور وہ ترجمان میں بایں الفاظ نقل ہوئی ہے ۔

" ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا غیبت کیا چیز ہے ؟ فرمایا یہ کہ تو کسی شخص کا ذکر اس طرح کرے کہ اگر وہ سنے تو اسے برا معلوم ہو ۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ اگرچہ وہ بات حق ہو ؟ فرمایا اگر تو باطل کہے تو یہی بہتان ہے ۔"

مذکورہ بالا دونوں حدیثوں پر خوب اچھی طرح غور کر کے غیبت کی وہ مختصر تعریف جو حضورؐ سے منقول ہوئی ہے ذہن کے سامنے رکھ لیجیے ۔ صاحب ترجمان کے نزدیک یہی تعریف غیبت کی جامع و مانع منطقی تعریف ہے جس میں کوئی مسلم تو درکنار کوئی غیر مسلم بھی موصوف کے نزدیک اپنی طرف سے کچھ ڈالنے یا اس میں سے کچھ نکالنے کی جسارت نہیں کر سکتا ۔ صاحب ترجمان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اکابر اہل علم نے اسی تعریف کو غیبت کی جامع و مانع منطقی تعریف سمجھا ہے اور اس میں کوئی کمی بیشی کرنے کی جسارت نہیں کی ہے ۔ اب آیئے دیکھیے کہ خود صاحب ترجمان اور ان اکابر اہل علم نے جن کے اقوال کے صاحب ترجمان نے حوالے دیئے ہیں ، اس تعریف کی کن کن شکلوں میں وضاحت فرمائی ہے ۔

اس تعریف میں دیکھ لیجیے کہ غیبت کا مفہوم صرف یہ بتایا گیا ہے کہ کسی شخص کا ذکر برائی سے کیا جائے ۔ اس ایک وصف کے علاوہ اس تعریف میں غیبت کے کسی بھی دوسرے وصف کا کوئی ذکر نہیں ہوا ہے ۔ حد یہ ہے کہ اس میں اس بات کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ یہ برائی پیٹھ پیچھے ہو یا رو در رو ۔ البتہ ایک سائل کے جواب میں اتنی بات ضرور واضح ہو گئی ہے کہ غیبت کسی واقعی برائی کے ذکر کو کہتے ہیں ۔ اگر کوئی بے بنیاد کوئی بات کسی کے متعلق کہی

جائے تو وہ غیبت نہیں بلکہ بہتان کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے ۔ صاحب ترجمان القرآن ایک طرف تو یہ فرماتے ہیں کہ اس تعریف میں مسلم تو مسلم کوئی غیر مسلم بھی سرِ مو اضافہ کی جسارت نہیں کر سکتا ۔ دوسری طرف ان کو معاً یہ بات یاد آ جاتی ہے کہ اس تعریف میں تو پیٹھ پیچھے کا بھی ذکر نہیں ہے تو وہ خود ہی اس میں پیٹھ پیچھے کا اضافہ کرنے کی جسارت فرماتے ہیں حالانکہ وہ صرف ایک مسلم ہی نہیں بلکہ مارشل لاء کے نفاذ سے پہلے تک ہمارے ملک میں " المسلم " بلکہ " ھو المسلم " کا درجہ رکھتے رہے ہیں ۔ اب سوال یہ ہے کہ موصوف کی اس " جسارت " سے حضورؐ کی تعریف مجروح ہوئی یا نہیں ؟ صاحب ترجمان فرماتے ہیں کہ پیٹھ پیچھے کا مفہوم تو غیبت میں موجود ہی ہے ۔ اب اگر کوئی شخص ان سے یہ گذارش کرے کہ جس طرح پیٹھ پیچھے کا مفہوم غیبت میں موجود ہے اسی طرح تحقیر و تذلیل کی نیت اور اخفا کی خواہش بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے تو صاحب ترجمان اس کو ایک جسارت سے کیوں تعبیر فرماتے ہیں ؟ کیا دین کے معاملات میں ساری " جسارتیں " کرنے کا حق صرف ایک قائد تحریک اسلامی ہی کو حاصل ہے ۔ دوسرا کوئی شخص کسی امر شرعی میں زبان کھولنے کی جسارت نہیں کر سکتا ؟

اب آگے بڑھیے اور یہ دیکھیے کہ دوسرے اکابر علم نے جن کے صاحب ترجمان نے حوالے دیئے ہیں کس کس طرح اپنی اپنی الگ الگ غیبت کی تعریفیں کی ہیں اور ان تعریفوں میں غیبت کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرنے کی " جسارت " کی ہے ۔

ابن الاثیر کی تعریف یہ ہے کہ ان تذکر الانسان فی غیبته بسوء وان کان فیه ۔

اس تعریف میں انھوں نے فی غیبته (پیٹھ پیچھے) کی قید کا اضافہ فرمایا ہے حالانکہ یہ الفاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل تعریف میں موجود نہیں ہیں ۔ اسی طرح انھوں نے وان کان فیه (اگرچہ وہ برائی اس میں ہو) کی شرط کا اضافہ اس وضاحت کی روشنی میں کیا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سائل کے جواب میں فرمائی تھی ، یہ شرط حضورؐ کی اصل تعریف میں موجود نہیں تھی ۔

امام نوویؒ نے حضورؐ کی اس تعریف کے ایک اور پہلو کو بے نقاب کیا وہ یہ کہ سواء ذکرته باللفظ او بالاشارة والرمز ۔ یعنی غیبت کے غیبت ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی کی برائی کا ذکر لفظوں ہی میں ہو بلکہ اشاروں اور کنایوں میں جو برائی ذکر میں آتی ہے وہ بھی غیبت ہی کے حکم میں ہے ۔ دیکھ لیجیے حضورؐ کی تعریف میں یہ وضاحت موجود نہیں ہے ۔

علامہ ابن حجر اس کے ایک اور پہلو کو کھولتے ہیں وہ یہ کہ ھو ان یذکرہ فی غیبته بما فیه مما یسوءہ قاصدا بذلك الافساد ۔ یعنی اس برائی کے ذکر سے مقصود درحقیقت فساد ڈلوانا ہو ۔ دوسرے

الفاظ میں اس کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ حافظ ابن حجر غیبت کے غیبت ہونے کے لیے یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کا محرک فاسد ہو۔ یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ حضورؐ کی تعریف میں محرک کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ یہ اضافہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔

یہ تو ان ائمہ لغت و حدیث و فقہ کی طرف سے حضورؐ کی تعریف غیبت کی وضاحت کی مثالیں ہوئیں۔ اب ذرا ایک آدھ مثالیں اس کے اندر سے استثنا کی بھی ملاحظہ فرمائیے۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں :-

هی ان یذکر الانسان عیب غیره من غیر محوج الی ذکر ذلک (غیبت یہ ہے کہ آدمی کسی شخص کا عیب بیان کرے بغیر اس کے کہ اس کے ذکر کی کوئی حاجت ہو) امام راغب کی اس تعریف کی رو سے کسی کی برائی کے ذکر کی وہ تمام صورتیں غیبت کے حکم سے خارج ہیں جن میں کسی کی برائی کا ذکر کسی ضرورت کی بنا پر ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ آپ کو کسی کا حلیہ بیان کرنا ہے، کسی کے ظلم کے خلاف فریاد کرنی ہے، کسی کے بارے میں مشورہ دینا ہے، کسی کے لیے حق نصیحت ادا کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ خوب ذہن نشین رہے کہ یہ امام راغب اس طرح کی ساری چیزوں کو غیبت کی تعریف ہی سے خارج کرتے ہیں، ان کے نزدیک یہ چیزیں غیبت کی تعریف میں سرے سے آتی ہی نہیں، وہ یہ نہیں کہتے کہ یہ چیزیں ہیں تو غیبت اور حرام لیکن حکمت عملی کے تحت یا مصلحت و ضرورت کے لیے جائز بن جاتی ہیں۔

اب غور فرمائیے کہ غیبت کی ایک تعریف بزعم صاحب ترجمان صاحب شریعت کی طرف سے موجود ہوتے ہوئے ان تمام ائمہ لغت و حدیث و فقہ نے اسی چیز کی اپنی اپنی طرف سے الگ الگ تعریفیں فرمائی ہیں یا نہیں؟ اور اس تعریف پر ایسے قیود و شرائط کا اضافہ کیا یا نہیں جو اس تعریف میں واضح نہ تھے؟ کیا ان سب بزرگوں نے اپنے اس طرز عمل سے حضورؐ کی تعریف کو العیاذ باللہ ناقص ٹھہرایا ہے؟ انھوں نے ناقص نہیں ٹھہرایا ہے بلکہ وہ قرآن و حدیث کا فہم رکھتے تھے اس وجہ سے اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ حضورؐ نے غیبت کی جو تعریف فرمائی ہے وہ کوئی منطقی اور فنی تعریف نہیں ہے بلکہ اس کے صرف ایک واضح پہلو کی طرف اشارہ ہے اس وجہ سے انھوں نے اپنی الگ الگ تعریفوں میں غیبت سے متعلق مختلف شرائط و قیود کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ حضورؐ کا ایجاز وضاحت کی روشنی میں آجائے۔ ہر شخص جس کا طرز فکر علمی ہوگا وہ ان مختلف اقوال کی باریکیوں کو سمجھ جائے گا۔ البتہ اخباری طرز فکر رکھنے والے لوگ ان باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اپنی سطحیت کی وجہ سے ہر سفید چیز کو چربی سمجھ بیٹھیں گے۔

ممکن ہے صاحب ترجمان کو یہ غلط فہمی ہو کہ ہر چیز کی منطقی اور فنی تعریفیں کرنا بھی نبوت کے فرائض و شرائط میں شامل ہے۔ اگر ان کو یہ غلط فہمی ہے تو یہ غلط فہمی انھیں دور کر ڈالنی چاہیے۔ یہ چیز ان کو دین کے سمجھنے کے معاملہ میں بہت سی الجھنوں میں ڈال دے گی۔ انبیاء علیہم السلام منطقی اور فنی تعریفیں نہیں کرتے بلکہ وہ ہر باب میں یہ بتاتے ہیں کہ کیا کیا کام کرنے کے ہیں اور کن کن چیزوں سے بچنا ہے۔ اگر کسی صاحب فن کو کسی چیز کی فنی تعریف کی ضرورت پیش آتی ہے تو اس شے سے متعلق تمام اوامر و نواہی تمام مکروہات و مستحبات اور تمام قیود و شرائط کو جمع کر کے اس کی فنی تعریف اسے خود کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے ہاں جتنی بھی اس طرح کی تعریفیں ہیں فقہا اور اہل اصول کی کی ہوئی ہیں، حضورؐ سے تو منطقی تعریفیں روزہ، نماز اور حج و زکوٰۃ تک کی بھی منقول نہیں ہیں، دوسری چیزوں کا کیا ذکر۔ یہ خیال اگر کسی کو ہو کہ غیبت سے متعلق چونکہ حضورؐ سے سوال کیا گیا تھا کہ غیبت کیا ہے؟ اس وجہ سے جواب میں آپ نے لازماً غیبت کی منطقی تعریف ہی فرمائی ہوگی تو یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے۔ اس طرح کے سیکڑوں سوالات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے گئے ہیں جو احادیث میں مذکور ہیں لیکن ان کے جو جواب حضورؐ نے مرحمت فرمائے ہیں ان پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اصل پیش نظر مقصد حضورؐ کے سامنے مخاطب کی تعلیم و تربیت ہے نہ کہ کسی چیز کی جامع و مانع منطقی تعریف۔ میں چاہوں تو اس کی متعدد مثالیں محض حافظہ کی مدد سے یہاں پیش کر سکتا ہوں لیکن طوالت بیان سے بچنے کے خیال سے صرف ایک مثال پر قناعت کرتا ہوں۔ مسلم کی روایت ہے :

عن النواس بن سمعان قال سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن البر والاثم فقال البر حسن الخلق والاثم ماحاك فی صدرك وكرهت ان یطلع علیه الناس۔

نواس بن سمعان سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور گناہ کے باب سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ نیکی حسن اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ چیز ہے جو تمہارے سینے میں کھٹکے اور جس سے لوگوں کا آگاہ ہونا تمہیں برا لگے۔

حضورؐ کے اس حکیمانہ جواب پر غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ جہاں تک تعلیم حکمت اور تربیت اخلاق کا تعلق ہے یہ ارشاد نبویؐ اسرار و معارف کا ایک خزانہ ہے، لیکن اگر کوئی شخص یہ دعوی کرے کہ یہ حضورؐ نے بر و اثم کی کوئی منطقی تعریف فرمائی ہے، تو یہ بات نہایت مضحکہ خیز ہوگی۔

ان ائمہ حدیث و فقہ نے غیبت کے غیبت ہونے کے لیے الگ الگ جو قیدیں اور شرطیں بیان کی ہیں میں نے انہی کو جمع کر کے غیبت کی ایک جامع و مانع تعریف ان لفظوں میں پیش کر دی ہے:

"غیبت یہ ہے کہ آدمی کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی کسی واقعی برائی کا اس کی تحقیر و تذلیل کی نیت سے چرچا کرے اور ساتھ ہی اس بات کا خواہشمند ہو کہ جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے اس کو اس کے اس فعل کی خبر نہ ہو۔"

اب آئیے صاحب ترجمان القرآن کے نقل کردہ اقوال کو سامنے رکھ کر اس تعریف کو پرکھیے کہ اس میں ان قیدوں اور شرطوں کے سوا میں نے کسی زاید قید یا شرط کا اضافہ کیا ہے جو ان بزرگوں سے منقول ہوئی ہیں؟

میں نے "پیٹھ پیچھے" کی قید لگائی ہے اس قید کا ضروری ہونا سب نے تسلیم کیا ہے۔ یہاں تک کہ صاحب ترجمان نے بھی اس کی ضرورت تسلیم فرمائی ہے۔

میں نے واقعی برائی کی قید لگائی ہے، اس چیز کی وضاحت ایک سائل کے جواب میں خود حضورؐ ہی نے فرما دی ہے۔

میں نے فساد نیت کا حوالہ دیا ہے اس کا ذکر علامہ ابن حجر اور امام راغب نے فرما دیا ہے۔

غرض میں نے غیبت کی تعریف میں کوئی اضافہ ایسا نہیں کیا ہے جس کے موید خود صاحب ترجمان نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر فراہم نہ کر دیئے ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ صاحب ترجمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم حکمت کے طریقے اور ایک لیجسلیچر کی قانون سازی میں کوئی فرق سمجھنے سے قاصر ہیں اور یہ فرق ان کو سمجھانا میرے بس میں نہیں ہے۔

البتہ آپ مجھ سے یہ ضرور پوچھ سکتے ہیں کہ میں نے اپنی تعریف میں اخفا کی خواہش کی قید کس دلیل کی بنا پر لگائی ہے۔ اس کے جواب میں میری گذارش یہ ہے کہ غیبت کرنے والے کی ایک سب سے بڑی اخلاقی کمزوری جس کی بنا پر غیبت اللہ اور رسول کے نزدیک ایک مبغوض فعل بنتی ہے، یہی ہے کہ وہ جس کی غیبت کرتا ہے نہ صرف اس سے اپنے اس فعل کو مخفی رکھنا چاہتا ہے بلکہ اس کے دوستوں اور عزیزوں سے بھی مخفی رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس کا پھیلایا ہوا زہر اپنا کام کر سکے اور فریق ثانی کی طرف سے اس کے تدارک کی کوئی تدبیر اختیار نہ کی جا سکے۔

اگر اخفا کی خواہش نہ ہو تو آدمی پیٹھ پیچھے کیوں کہے، پھر جو کچھ کہنا ہے منہ ہی پر نہ کہے؟ زندگی کے عملی واقعات میں سے ایک مثال بھی کسی ایسی غیبت کی پیش نہیں کی جا سکتی جو اس خواہش سے مستثنیٰ قرار دی جا سکے۔ صاحب ترجمان نے ایک دو فرضی مثالیں پیش کرنے کی جو کوشش فرمائی ہے ان پر غور کر کے دیکھ لیجیے کہ ان سے کسی پہلو سے بھی ان کے نقطہ نظر کی تائید نکلتی ہے۔ (باقی صفحہ ۵۸ پر)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

سورۂ بقرہ

۱۔ سورہ کا مرکزی مضمون

اس سورہ کا مرکزی مضمون دعوت ایمان ہے۔ ایمان کی طرف اشارہ تو جیسا کہ ہم نے بیان کیا سورۂ فاتحہ میں بھی ہو چکا ہے لیکن وہ اجمالی ایمان ہے جو جذبۂ شکر کی تحریک اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و رحمت کی نشانیوں کے مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سورہ میں اس اجمال نے تفصیل کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اس میں نہایت واضح طور پر قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ گویا سورۂ فاتحہ میں ایمان باللہ کا ذکر ہے اور سورۂ بقرہ میں ایمان بالرسالت کا۔

ایمان کی اصل حقیقت ایمان بالرسالت ہی سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ اگر ایمان بالرسالت موجود نہ ہو تو مجرد ایمان باللہ جاری زندگی کو اللہ کے رنگ میں نہیں رنگ سکتا۔ زندگی پر اللہ کا رنگ اسی وقت چڑھتا ہے جب ایمان باللہ کے ساتھ ساتھ ایمان بالرسالت بھی پایا جائے۔

ایمان بالرسالت پیدا ایمان باللہ ہی سے ہوتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ مقدم الذکر ثانی الذکر ہی کا ایک بالکل فطری نتیجہ ہے۔ ایمان باللہ سے بندہ کے اندر خدا کی ہدایت کے لیے ایک پیاس اور ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ یہی پیاس اور تڑپ ہے جس کا اظہار سورۂ فاتحہ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی دعا سے ہوا ہے۔ اسی دعا کے جواب میں یہ سورۂ بقرہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دے رہی ہے۔ گویا بندے کو بتایا جا رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی بندگی کے حق کو تسلیم کر چکنے کے بعد اس کے راستہ کی تلاش ہے تو اس کتاب پر اور اس رسولؐ پر ایمان لاؤ جس پر یہ کتاب اتری ہے۔

اسی حقیقت کی روشنی میں اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سورہ فاتحہ اگرچہ بظاہر ایک نہایت چھوٹی سی سورہ ہے، لیکن فی الحقیقت وہ ایک نہایت ہی عظیم الشان سورہ ہے۔ کیونکہ اس کے تنے سے پہلی ہی شاخ جو پھوٹی ہے وہی اتنی بڑی ہے کہ ہماری ساری زندگی پر حاوی ہو گئی ہے۔ اس سے ہماری اس بات کی تصدیق ہوتی ہے جس کی طرف ہم نے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں اشارہ کیا ہے کہ پورا قرآن درحقیقت اسی سورہ فاتحہ کے تخم سے پیدا ہوا ہے اور یہ اسی شجرہ طیبہ کے برگ و بار ہیں جو قرآن کے پورے تیس پاروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

۲ - سورہ میں خطاب

اس سورہ میں اصل خطاب تو یہود سے ہے لیکن ضمناً اس میں جگہ جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، مسلمانوں کو، اور بنی اسماعیلؑ کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔

یہود کو مخاطب کر کے ان کے ان تمام مزعومات و توہمات کی تردید کی گئی ہے جن کے سبب سے وہ اپنے آپ کو پیدائشی حقدار امامت و سیادت سمجھے بیٹھے تھے اور کسی ایسے نبی پر ایمان لانا اپنی توہین سمجھتے تھے جو ان کے خاندان سے باہر امّی عربوں میں پیدا ہوا ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مخاطب کر کے جگہ جگہ آپ کو صبر اور استقامت کی نصیحت کی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت جو دعا کی تھی آپ اس دعا کے مظہر ہیں اور مخالفین کی تمام حاسدانہ سرگرمیوں کے علی الرغم آپ کی دعوت کامیاب ہو کے رہے گی۔ اور اللہ تعالیٰ آپ کے دین کو غالب کرے گا۔

مسلمانوں سے خطاب کر کے یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلق پر اپنے دین کی حجت تمام کرنے کے لیے ان کو ایک مستقل امت کی حیثیت سے مامور کیا ہے اور اپنی آخری شریعت کا ان کو امین بنایا ہے، انھیں چاہیے کہ وہ اس امانت کی قدر کریں اور اس کے حامل بنیں تاکہ وہ خلق کے رہنما اور اپنے بعد والوں کے لیے نمونہ اور مثال بن سکیں۔

اسی ضمن میں ان کو جگہ جگہ یہود کی ان حاسدانہ سرگرمیوں سے بھی آگاہ کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے دلوں میں شکوک پیدا کرنے، ان کو ورغلانے اور ان کو آخری بعثت کی نعمتوں سے محروم کرنے کے لیے ان کی طرف سے ظاہر ہو رہی تھیں۔

بنی اسماعیل کو مخاطب کر کے ان کے سامنے اصل دین ابراہیمی ان تمام بدعتوں اور خرابیوں سے پاک کر کے

پیش کیا گیا ہے جو مشرکین اور یہود نے اس میں پیدا کر دی تھیں اور ساتھ ہی ان پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنا آخری نبی تمہارے اندر سے اٹھایا، اور تمہیں ایک امت مسلمہ بنانا چاہا، تم اس احسان کی قدر کرو اور یہودیوں کی حاسدانہ چالوں کے چکر میں نہ پھنسو۔ ورنہ تم پرائے شگون پر خود اپنی ناک کٹوا بیٹھو گے۔

۳ - سورہ کے مطالب کا ایک سرسری جائزہ

سورہ کے مطالب کا تفصیلی تجزیہ تو اس وقت سامنے آئے گا جب ہم آیات کے مناسب حصوں کو الگ الگ کر کے ان کی تفسیر کریں گے لیکن یہاں بھی ہم اس کے مطالب کا ایک سرسری جائزہ پیش کیے دیتے ہیں۔ اس سے سورہ کے عمود کے ساتھ اس کے ہر حصہ کا تعلق بھی سمجھنے میں مدد ملے گی اور سورہ پر بحیثیت مجموعی ایک اجمالی نظر بھی پڑ جائے گی۔

ہمارے نزدیک مضامین کی تقسیم کے لحاظ سے یہ سورہ ایک تمہید، چار ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے[۱]:

(۱ - ۳۹) یہ حصہ تمہیدی ہے۔ اس میں پہلے تو یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس کتاب پر کون لوگ ایمان لائیں گے، کون لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ پھر ایمان نہ لانے والوں کی رکاوٹیں اور ان کی وہ ذہنی الجھنیں بیان ہوئی ہیں جن میں وہ قرآن کے نزول کے بعد مبتلا ہو گئے تھے۔ اسی ضمن میں بنی اسمٰعیل کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ان پر اللہ کی اس کتاب نے حجت تمام کر دی ہے، اب ان کی شامت ہی ہے جو یہودی فتنہ پردازوں کے چکموں میں آ کر وہ اپنے آپ کو اس نعمت عظمیٰ سے محروم کر بیٹھیں۔

یہ تمہیدی حصہ آدم کی خلافت اور شیطان کی حاسدانہ مخالفت کی سرگزشت پر ختم ہوتا ہے۔ آدم اور شیطان کی یہ سرگزشت ایک آئینہ ہے جس میں اس تمام مخالفت اور موافقت کی پوری تصویر سامنے آ جاتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت اور قرآن کی دعوت سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ فرشتوں کا آدم کی خلافت پر اعتراض کرنا اور اپنے اعتراض کا جواب پا جانے کے بعد مطمئن ہو جانا مثال ہے ان لوگوں کی مخالفت کی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے بعض پہلو نہ سمجھنے کے سبب سے شروع شروع میں آپ کی رسالت کے بارہ میں متردد یا اس کے مخالف رہے لیکن چونکہ یہ لوگ نیک دل

---

[۱] اس تجزیہ کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنے سامنے کوئی ایسا قرآن مجید رکھ لیجیے جس میں آیتوں پر نمبر لگے ہوئے ہوں۔

اور حق پسند تھے، حاسد اور ہٹ دھرم نہ تھے، اس وجہ سے جونہی ان پر اصل حقیقت واضح ہو گئی وہ آپ کے حامی اور مددگار بن گئے۔

اس کے برخلاف شیطان کی مخالفت مثال ہے ان لوگوں کی مخالفت کی جو غرورِ نسب، غرورِ جاہ یا حسد کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے۔ مثلاً یہود اور سردارانِ قریش۔ اس طرح کی مخالفت کرنے والوں کی مخالفت اصل حقیقت کے واضح ہونے سے دور نہیں ہوتی بلکہ اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی صداقت جتنی ہی زیادہ واضح ہوتی گئی اتنی ہی ان لوگوں کی عداوت بھی بڑھتی گئی۔

اس تصویر میں یہود اور ان کے ہم نواؤں پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ آدم کی خلافت کے خلاف جس نوعیت کا غم و غصہ اور حسد ابلیس کو تھا اسی نوعیت کا غم و غصہ اور حسد اللہ کے آخری رسول کے خلاف تم کو ہے۔ اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ جس طرح ابلیس کے غم و غصہ کے علی الرغم آدم کی خلافت قائم ہو کے رہی اسی طرح تمہاری دشمنی اور تمہارے حسد کے علی الرغم نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت قائم ہو کے رہے گی۔

۳۹ - ۱۲۱ اس حصہ میں بنی اسرائیل کو تصریح کے ساتھ مخاطب کر کے پہلے ان کو اس بات کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس نبی امی پر ایمان لائیں جس کی بعثت کی پیشین گوئیاں خود ان کے اپنے صحیفوں میں بھی موجود ہیں۔ پھر ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ جب دعوتِ حق کی تائید و حمایت میں سبقت کرنے کے لیے ان سے تورات میں عہد لیا جا چکا ہے، دنیا پرستی اور حسد میں مبتلا ہو کر اس کی مخالفت کے لیے سبقت نہ کریں۔ نیز اس ذلیل مقصد کے لیے حق اور باطل کو باہم گڈمڈ کرنے کا جو کاروبار انھوں نے جاری کر رکھا ہے اس سے باز آئیں۔ اور اس جہادِ نفس میں صبر اور نماز سے مدد حاصل کریں۔ (۴۰ - ۴۶)

اس کے بعد یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا کے ہاں عزت و تقرب کا ذریعہ ایمان اور عمل صالح ہے نہ کہ کسی خاص خاندان یا کسی خاص گروہ سے وابستہ ہونا۔ یہود اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ان کو جو عزت و عظمت حاصل ہوئی ہے وہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہونے کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ اس غلط فہمی کے سبب سے ان کا سارا اعتماد ایمان اور عمل صالح کے بجائے محض اپنی خاندانی اور گروہی نسبت پر رہ گیا تھا۔ اور یہ غرہ ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے میں بہت بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ یہاں ان پر واضح کیا گیا ہے کہ تمام فضل و کرم اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، جو فضل بھی تم پر ہوا ہے اسی کی طرف سے ہوا ہے اور جو فضل بھی ہوگا اسی کی طرف سے ہوگا۔ اس نے تم پر فضل بھی بڑے بڑے کیے ہیں اور تمہاری ناشکریوں پر

تم کو سزائیں بھی بار بار دی ہیں۔ اس وجہ سے خاندان اور نسب کی نسبتوں کے بجائے اللہ کی طرف رجوع کرو اور اوہام میں مبتلا ہو کر حقائق سے منہ نہ موڑو۔ (۴۷ - ۶۳)

اس کے بعد یہود کی عہد شکنیوں کی پوری تاریخ بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے کس کس طرح خدا سے کیے ہوئے عہد و پیمان اور خدا کے دیے ہوئے احکام توڑے ہیں اور عہد شکنی اور غداری کے لیے کیسی مجرمانہ ذہنیت شروع ہی سے ان کے اندر پرورش پاتی رہی ہے۔ نیز ان کے وہ اوہام اور وہ مشاغل بھی بیان ہوئے ہیں جن میں مبتلا ہو جانے کے سبب سے ان کی نگاہوں میں خدا اور اس کی شریعت اور اس کی کتاب کی کوئی قدر سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔

یہ ساری تفصیل یہود پر یہ واضح کرنے کے لیے بیان کی گئی ہے کہ اگرچہ وہ کتاب الٰہی کے حامل ہونے کے مدعی ہیں لیکن فی الحقیقت انھوں نے اس کتاب کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے تمام عہد و پیمان انھوں نے توڑ ڈالے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے منصب امامت سے معزول کرے اور یہ امانت ان کے حوالہ کرے جو اس کے اہل ہوں۔ (۶۴ - ۱۲۱)

۱۲۲ — ۱۶۲ اس باب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگذشت کا وہ حصہ بیان ہوا ہے جو خانہ کعبہ کی تعمیر نیز ایک امت مسلمہ کے قیام اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی دعا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں پہلے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذریت کا دین اسلام تھا، نہ کہ یہودیت و نصرانیت۔ اسی اسلام کی دعوت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک امت وسط پیدا کی ہے۔ اس امت وسط کا قبلہ دعائے ابراہیمی کے بموجب مسجد حرام ہے نہ کہ بیت المقدس۔ بیت المقدس کی طرف اس کا نماز پڑھنا محض ایک عارضی معاملہ تھا چنانچہ اس کا قبلہ بدل دیا گیا۔

اس کے بعد ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ یہ قبلہ چونکہ ابھی مشرکین کے قبضہ میں ہے، اس وجہ سے اس کو حاصل کرنے کے لیے اہل ایمان کو جان اور مال کی قربانیاں بھی دینی پڑیں گی۔ اور اس جہاد میں کامیابی اللہ تعالیٰ کی مدد سے حاصل ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کی یہ مدد صبر اور نماز کے ذریعے سے حاصل ہوگی۔

اس ساری سرگذشت کے سنانے سے مقصود چونکہ یہ واضح کرنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس پیغمبر اور جس امت کے لیے دعا کی تھی وہ یہی ہیں، انھی کی دعوت اصل ملت ابراہیمی کی دعوت اور انھی کا قبلہ اصل قبلۂ ابراہیمی ہے۔ اس وجہ سے اس میں خانۂ کعبہ اور مروہ وغیرہ سے متعلق یہود کی وہ تمام تحریفات بھی بے نقاب کی گئی ہیں جو انھوں نے اپنے صحیفوں میں اس خیال سے کی تھیں کہ خانۂ کعبہ اور مروہ کی قربان گاہ کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعلق کی

پر شہادت ریکارڈ سے حذف کر دیں۔

۱۶۳ — ۲۴۲ یہ احکام و قوانین کا باب ہے۔ ملتِ مسلمہ کو جو شریعت عطا ہوئی ہے اس باب میں اسی شریعت کے بنیادی قوانین بیان ہوئے ہیں۔ یہود یا مشرکین نے ان احکام میں جو تحریفات کر دی تھیں یا جو بدعتیں شامل کر دی تھیں اس باب میں ان بدعتوں اور تحریفات سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے۔ ان احکام کے بیان کرنے میں فقہی ترتیب ملحوظ نہیں ہے بلکہ وقت کے حالات اور تعلیم و تربیت کے مصالح نے جس ترتیب کا تقاضا کیا ہے، وہ ترتیب ملحوظ ہے۔ بالاجمال یہ احکام یہ ہیں: توحید (۱۶۳ - ۱۷۶) نماز اور زکوٰۃ (۱۷۷) قصاص اور دیت (۱۷۸ - ۱۷۹) وصیت (۱۸۰ - ۱۸۲) روزہ (۱۸۳ - ۱۸۷) حرام خوری اور رشوت کی ممانعت (۱۸۸) حج اور اس تعلق سے جہاد اور انفاق کے احکام کیونکہ اس وقت تک خانۂ کعبہ پر مشرکین کا قبضہ تھا (۱۸۹ - ۲۱۸) شراب اور جوئے کی ممانعت، یتامیٰ کی اصلاحِ حال کے خیال سے ان کے معاملات کو اپنے معاملات کے ساتھ ملا لینے کی اجازت، مشرکات کے ساتھ نکاح کی ممانعت[1] (۲۱۹ - ۲۲۱) نکاح، طلاق، ایلاء، خلع، رضاعت، نان نفقہ، زوجہ متوفی عنہا، مہر اور ازدواجی زندگی سے متعلق دوسرے مسائل (۲۲۲ - ۲۴۲)

۲۴۳ — ۲۸۳ اس باب میں مرکزِ ملتِ ابراہیمی — خانۂ کعبہ — کو کفار کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لیے مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا گیا ہے۔ اس جہاد ہی کے مقصد سے انفاق کا جذبہ ابھارا گیا ہے۔ بنی اسرائیل نے اپنے قبلہ کو فلسطینیوں سے آزاد کرانے کے لیے جو جنگ لڑی اور جو مختلف پہلوؤں سے ہمارے غزوہ بدر سے مشابہ بھی اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ پھر ایک جملہ معترضہ کے بعد انفاق پر مزید زور دیا گیا ہے۔ اور اسی سلسلہ میں مثالوں سے واضح فرمایا گیا ہے کہ کس طرح کے لوگ ہیں جن کو خدا تاریکی سے روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اور کس طرح کے لوگوں کو تاریکیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد انفاق کی برکات، اس کے شرائط، اس کی خصوصیات اور اس کے بعض اہم مصارف کی طرف اشارات ہیں اور ساتھ ہی جو چیز اس کی بالکل ضد ہے یعنی سود، اس کی حرمت بیان کی گئی ہے۔ اور قرض کے لین دین میں جو احتیاط اسلامی نقطۂ نظر سے ضروری ہے اس کے متعلق بعض احکام دیئے گئے ہیں۔

۲۸۴ — ۲۸۶ اس حصہ کی حیثیت سورہ کے خاتمہ کی ہے۔ اس میں پہلے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، وہ تمام کھلے اور ڈھکے کا حساب لے گا اور پھر جس کو

[1] یہ تینوں مسائل جیسا کہ ہم آگے چل کر ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے واضح کریں گے انفاق کے حکم کے تعلق سے پیدا ہوئے ہیں۔

چاہے گا بخشے گا، اور جس کو چاہے سزا دے گا۔ اس کے بعد یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ یہ کتاب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری گئی ہے کوئی اس کو مانے یا نہ مانے لیکن اللہ کے رسولؐ اور اہلِ ایمان نے اس کو مان لیا ہے۔ اس کے بعد اہلِ ایمان کی دعا پر یہ سورہ ختم ہوتی ہے۔ اس دعا کے لفظ لفظ سے کتابِ الٰہی کے بارہ میں اس عظیم ذمہ داری کا احساس نمایاں ہو رہا ہے جس کو یہود اور نصاریٰ سنبھال نہ سکے اور جو اب اس امت پر ڈالی جا رہی ہے۔

سورۂ بقرہ

مدنی — زمانۂ نزول اوائل ہجرت — آیات ۲۸۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ (۱) ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲) الَّذِيْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳)
وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ
هُمْ يُوْقِنُوْنَ (۴) اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵)

ترجمہ: یہ الف، لام، میم ہے۔ یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔ ان لوگوں کے لیے جو غیب میں رہتے ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور ان کے لیے جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی ہے، اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے اور آخرت پر یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

۴۔ الفاظ اور جملوں کی وضاحت

الٓمّٓ: یہ ایک مستقل جملہ ہے۔ عربی زبان کے عام قاعدہ کے مطابق یہاں مبتدا محذوف ہے۔ اس کو ظاہر کردیا جائے تو پوری بات یوں ہوگی۔ ھٰذا الٓمّٓ (یہ الف، لام، میم ہے)۔ ہم نے ترجمہ میں اس محذوف کو کھول دیا ہے۔

یہ اور اسی طرح کے جتنے حروف بھی مختلف سورتوں کے شروع میں آتے ہیں چونکہ الگ الگ کرکے پڑھے جاتے

ہیں اس وجہ سے ان کو حروفِ مقطعات کہتے ہیں۔

یہ جس سورہ میں بھی آتے ہیں بالکل شروع میں اسی طرح آتے ہیں جس طرح کتابوں، فصلوں اور ابواب کے شروع میں ان کے نام آیا کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں۔ قرآن نے جگہ جگہ ذٰلِكَ اور تِلْكَ کے ذریعہ سے ان کی طرف اشارہ کرکے ان کے نام ہونے کو اور زیادہ واضح کردیا ہے۔ حدیثوں سے بھی ان کا نام ہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔

جو سورتیں ان ناموں سے موسوم ہیں اگرچہ ان میں سے سب اپنے انہی ناموں سے مشہور نہیں ہوئیں، بلکہ بعض دوسرے ناموں سے مشہور ہوئیں لیکن ان میں سے کچھ اپنے انہی ناموں سے مشہور بھی ہیں۔ مثلاً طٰہٰ، یٰس، قٓ اور نٓ وغیرہ۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ قرآن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ ایک بالکل واضح کتاب ہے اس میں کوئی چیز بھی چیستاں یا معمے کی قسم کی نہیں ہے، پھر اس نے سورتوں کے نام ایسے کیوں رکھ دیے جن کے معنی کسی کو بھی نہیں معلوم؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک ان حروف کا تعلق ہے یہ اہل عرب کے لیے کوئی بیگانہ چیز نہیں تھے۔ بلکہ وہ ان کے استعمال سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس واقفیت کے بعد قرآن کی سورتوں کا ان حروف سے موسوم ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے قرآن کے ایک واضح کتاب ہونے پر کوئی حرف آتا ہو۔ البتہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح حروف سے نام بنالینا عربوں کے مذاق کے مطابق تھا یا نہیں تو اس چیز کے مذاق عرب کے مطابق ہونے کی سب سے بڑی شہادت تو یہی ہے کہ قرآن نے نام رکھنے کے اس طریقہ کو اختیار کیا۔ اگر نام رکھنے کا یہ طریقہ کوئی ایسا طریقہ ہوتا جس سے اہل عرب بالکل ہی نامانوس ہوتے تو وہ اس پر ضرور ناک بھوں چڑھاتے اور ان حروف کی آڑ لے کر کہتے کہ جس کتاب کی سورتوں کے نام تک کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتے اس کے ایک کتاب مبین ہونے کے دعوے کو کون تسلیم کرسکتا ہے۔

قرآن پر اہل عرب نے بہت سے اعتراضات کیے اور ان کے یہ سارے اعتراض قرآن نے نقل بھی کیے ہیں لیکن ان کے اس طرح کے کسی اعتراض کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان ناموں میں ان کے لیے کوئی اجنبیت نہیں تھی۔

علاوہ بریں جن لوگوں کی نظر اہل عرب کی روایات اور ان کے لٹریچر پر ہے وہ جانتے ہیں کہ اہل عرب نہ صرف

یہ کہ اس طرح کے ناموں سے نامانوس نہیں تھے بلکہ وہ خود اشخاص، چیزوں، گھوڑوں، جھنڈوں، تلواروں حتیٰ کہ قصائد اور خطبات تک کے نام اسی سے ملتے جلتے رکھتے تھے۔ یہ نام مفرد حروف پر بھی ہوتے تھے اور مرکب بھی ہوتے تھے۔ ان میں یہ اہتمام بھی ضروری نہیں تھا کہ اسم اور مسمّٰی میں کوئی معنوی مناسبت پہلے سے موجود ہو بلکہ یہ نام ہی بتاتا تھا کہ یہ نام اس مسمّٰی کے لیے وضع ہوا ہے۔

اور یہ ایک بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ جب ایک شے کے متعلق یہ معلوم ہوگیا کہ یہ نام ہے تو پھر اس کے معنی کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا کیوں کہ نام سے اصل مقصود مسمّٰی کا اس نام کے ساتھ خاص ہوجانا ہے نہ کہ اس کے معنی۔ کم از کم فہم قرآن کے نقطۂ نظر سے ان ناموں کے معانی کی تحقیق کی تو کوئی اہمیت ہے نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ چونکہ یہ نام اللہ تعالیٰ کے رکھے ہوئے ہیں اس وجہ سے آدمی کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ضرور یہ کسی نہ کسی مناسبت کی بنا پر رکھے گئے ہوں گے۔ یہ خیال فطری طور پر طبیعت میں ایک جستجو پیدا کردیتا ہے۔ اسی جستجو کی بنا پر ہمارے بہت سے پچھلے علماء نے ان ناموں پر غور کیا اور ان کے معنی معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ان کی جستجو سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا لیکن ہمارے نزدیک ان کا یہ کام بجائے خود غلط نہیں تھا اور اگر ہم بھی ان پر غور کریں گے تو ہمارا یہ کام بھی غلط نہیں ہوگا۔ اگر اس کوشش سے کوئی حقیقت واضح ہوئی تو اس سے ہمارے علم میں اضافہ ہوگا اور اگر کوئی بات نہ مل سکی تو اس کو ہم اپنے علم کی کوتاہی اور قرآن کے اتھاہ ہونے پر محمول کریں گے۔ یہ رائے بہرحال نہیں قائم کریں گے کہ یہ نام ہی بے معنی ہیں۔

اپنے علم کی کمی اور قرآن کے اتھاہ ہونے کا یہ احساس بجائے خود ایک بہت بڑا علم ہے۔ اس احساس سے علم و معرفت کی بہت سی بند راہیں کھلتی ہیں۔ اگر قرآن کا پہلا ہی حرف اس عظیم انکشاف کے لیے کلید بن جائے تو یہ بھی قرآن کے بہت سے معجزوں میں سے ایک معجزہ ہوگا۔ یہ اسی کتاب کا کمال ہے کہ اس کے جس حرف کا راز کسی پر نہ کھل سکا اس کی پیدا کردہ کاوش ہزاروں سربستہ اسرار سے پردہ اٹھانے کے لیے دلیل راہ بنی۔

ان حروف پر ہمارے پچھلے علماء نے جو رائیں ظاہر کی ہیں ہمارے نزدیک وہ تو کسی مضبوط بنیاد پر مبنی نہیں ہیں اس وجہ سے ان کا ذکر کرنا کچھ مفید نہیں ہوگا۔ البتہ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اجمالاً میں بیان پیش کرتا ہوں۔ اس سے اصل مسئلہ اگرچہ حل نہیں ہوتا لیکن اس کے حل کے لیے ایک راہ کھلتی ضرور نظر آتی ہے۔ کیا عجب کہ مولانا نے جو سراغ دیا ہے دوسرے اس کی رہنمائی سے کچھ مفید

تر نتائج راہ اور معلوم کرلیں اور اس طرح درجہ بدرجہ تحقیق کے قدم کچھ اور آگے بڑھ جائیں۔

جو لوگ عربی رسم الخط کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ عربی زبان کے حروف عبرانی سے لیے گئے ہیں۔ اور عبرانی کے یہ حروف ان حروف سے ماخوذ ہیں جو عرب قدیم میں رائج تھے۔ عرب قدیم کے ان حروف کے متعلق استاذ امامؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ انگریزی اور ہندی کے حروف کی طرح صرف آواز ہی نہیں بتاتے تھے بلکہ یہ چینی زبان کے حروف کی طرح معانی اور اشیاء پر بھی دلیل ہوتے تھے اور جن معانی یا جن اشیاء پر وہ دلیل ہوتے تھے عموماً انہی کی صورت و ہیئت پر لکھے بھی جاتے تھے۔ مولانا کی تحقیق یہ ہے کہ یہی حروف ہیں جو قدیم مصریوں نے اخذ کیے اور اپنے تصورات کے مطابق ان میں ترمیم و اصلاح کرکے ان کو اس خط تمثال کی شکل دی جس کے آثار اہرام مصر کے کتبات میں موجود ہیں۔

ان حروف کے معانی کا علم اب اگرچہ مٹ چکا ہے تاہم بعض حروف کے معنی اب بھی معلوم ہیں اور ان کے لکھنے کے ڈھنگ میں بھی ان کی قدیم شکل کی کچھ نہ کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔ مثلاً الف کے متعلق معلوم ہے کہ وہ گائے کے معنی بتاتا تھا اور گائے کے سر کی صورت ہی پر لکھا بھی جاتا تھا۔ ب کو عبرانی میں بیت کہتے بھی ہیں اور اس کے معنی بھی بیت (گھر) کے ہیں۔ ج کا عبرانی تلفظ جیمل ہے جس کے معنی جمل (اونٹ) کے ہیں۔ ط سانپ کے معنی میں آتا تھا اور لکھا بھی کچھ سانپ ہی کی شکل پر جاتا تھا۔ م پانی کی لہر پر دلیل ہوتا تھا اور اس کی شکل بھی لہر سے ملتی جلتی بنائی جاتی تھی۔

مولانا اپنے نظریہ کی تائید میں سورۂ "ن" کو پیش کرتے ہیں۔ حرف نون اب بھی اپنے قدیم معنی ہی میں بولا جاتا ہے۔ اس کے معنی مچھلی کے ہیں۔ اور جو سورہ اس نام سے موسوم ہوئی ہے اس میں حضرت یونسؑ علیہ السلام کا ذکر صاحب الحوت (مچھلی والے) کے نام سے آیا ہے۔ مولانا اس نام کو پیش کرکے فرماتے ہیں کہ اس سے ذہن قدرتی طور پر اس طرف جاتا ہے کہ اس سورہ کا نام "نون" (ن) اسی وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس میں صاحب الحوت (یونس علیہ السلام) کا واقعہ بیان ہوا ہے جن کو مچھلی نے نگل لیا تھا۔ پھر کیا عجب ہے کہ بعض دوسری سورتوں کے شروع میں جو حروف آئے ہیں وہ بھی اپنے قدیم معانی اور سورتوں کے مضامین کے درمیان کسی مناسبت ہی کی بنا پر آئے ہوں۔

قرآن مجید کی بعض اور سورتوں کے ناموں سے بھی مولانا کے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً حرف "ط" کے معنی، جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے، سانپ کے تھے اور اس کے لکھنے کی ہیئت بھی سانپ کی ہیئت سے

ملتی جلتی ہوتی تھی۔ اب قرآن میں سورہ طٰہٰ کو دیکھیے جو "ط" سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں ایک مختصر تمہید کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی لٹھیا کے سانپ بن جانے کا قصہ بیان ہوتا ہے۔ اسی طرح طسم، طس وغیرہ بھی "ط" سے شروع ہوتی ہیں اور ان میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لٹھیا کے سانپ کی شکل اختیار کر لینے کا معجزہ مذکور ہے۔

الف کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ گائے کے سر کی ہیئت پر لکھا بھی جاتا تھا اور گائے کے معنی بتاتا بھی تھا۔ اس کے دوسرے معنی اللہ واحد کے ہوتے تھے۔ اب قرآن مجید میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ سورۂ بقرہ میں جس کا نام الف سے شروع ہوتا ہے، گائے کے ذبح کا قصہ بیان ہوا ہے۔ دوسری سورتیں جن کے نام الف سے شروع ہوئے ہیں توحید کے مضمون میں مشترک نظر آتی ہیں۔ یہ مضمون ان میں خاص اہتمام کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ان ناموں کا یہ پہلو بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ جن سورتوں کے نام ملتے جلتے ہیں ان کے مضامین بھی ملتے جلتے ہیں بلکہ بعض سورتوں میں تو اسلوب بیان تک ملتا جلتا ہے۔

میں نے مولانا کا یہ نظریہ، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، محض اس خیال سے پیش کیا ہے کہ اس سے حروف مقطعات پر غور کرنے کے لیے ایک علمی راہ کھلتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی حیثیت ابھی تک ایک نظریہ سے زیادہ نہیں ہے۔ جب تک تمام حروف کے معانی کی تحقیق ہو کر ہر پہلو سے ان ناموں اور ان سے موسوم سورتوں کی مناسبت واضح نہ ہو جائے اس وقت تک اس پر ایک نظریہ سے زیادہ اعتماد کر لینا صحیح نہیں ہوگا۔ یہ محض علوم قرآن کے قدردانوں کے لیے ایک اشارہ ہے، جو لوگ مزید تحقیق و جستجو کی ہمت رکھتے ہیں وہ اس راہ میں قسمت آزمائی کریں۔ شاید اللہ تعالیٰ اس راہ سے یہ مشکل آسان کر دے۔

سیرت سیّد احمد شہید

مصنف: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

سید صاحب موصوف کی مفصل سوانح حیات، آپکے اصلاحی و تجدیدی کارناموں کی داستان، اصلاح و تجدید اور احیائے خلافت کی تاریخ، اہم مقامات کے نقشے، کتابت طباعت عمدہ، سرورق دیدہ زیب۔

ضخامت ۴۸۸ صفحات قیمت صرف آٹھ روپے آٹھ آنے

دیگر دینی و علمی کتب ملنے کا پتہ: المکتبۃ الرحمانیہ اچھرہ لاہور

تزکیۂ نفس

امین احسن طلاحی

حج اور آفاتِ حج

ہم نے تمہید والی فصل[1] میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نفس انسانی کی جملہ خرابیوں کی اصلاح کے لیے حج کی حیثیت ایک اکسیر جامع کی ہے۔ اس ایک ہی نسخہ کے اندر ان تمام نسخوں کے اصل اجزا جمع کر دیئے گئے ہیں جو اسلام نے الگ الگ امراض کے لیے الگ الگ تجویز کیے ہیں۔ یہ نسخہ ایک جامع نسخہ بھی ہے اور اگر اس کو صحیح طریقہ پر استعمال کیا جائے تو اس کا مفید ہونا بھی ایک حتمی اور قطعی شے ہے۔ پہلے ہم اس کی جامعیت پر روشنی ڈالیں گے۔

حج جامع عبادات ہے

اس عبادت کی جامعیت کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ اسلام نے جتنی عبادتیں بھی مقرر فرمائی ہیں سب کی روح اس کے اندر، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، موجود ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

نماز دین کی تمام عبادتوں میں اساس اور ستون کی حیثیت رکھتی ہے، اب آئیے دیکھیے کہ یہ عبادت حج میں کس طرح شامل ہے۔

سب سے زیادہ واضح پہلو تو یہ ہے کہ حج کا سفر آدمی کرتا ہی ہے اس گھر کے لیے جو ہماری تمام نمازوں اور ہماری تمام مسجدوں کا مرکز ہے۔ نماز کے لیے پہلا گھر جو اس زمین پر تعمیر ہوا ہے وہ بیت اللہ ہے اور ہماری تمام مسجدوں کو مسجد ہونے کا جو شرف حاصل ہوا ہے وہ اسی گھر کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ اسی وجہ سے جب کوئی شخص حج کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو اس کے اس سفر کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جس مرکز نماز کی طرف رخ کر کے وہ زندگی بھر نماز پڑھتا رہا ہے وہ چاہتا ہے کہ اب عین اس مرکز میں پہنچ کر نماز پڑھے اور جس مسجد نے دنیا کی تمام مسجدوں کو مسجدیت کا اعزاز بخشا ہے عین اس مسجد میں جا کر سجدہ ریز ہو۔

[1] اس سلسلہ مباحث کی یہ فصل ترجمان القرآن اور المنبر لائل پور کے صفحات میں شائع ہو چکی ہے

علاوہ ازیں حج میں نماز کی وہ قسم بھی شامل ہے جس کے ادا کرنے کی سعادت آدمی کو حج کے سوا اور کسی دوسرے موقع پر حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ میری مراد طواف سے ہے۔ قرآن مجید کے اشارات اور احادیث کی تصریحات سے ثابت ہے کہ طواف بھی درحقیقت نماز ہے۔ یہ نماز صرف خانہ کعبہ کے اردگرد ہی ادا کی جا سکتی ہے۔ اس کے سوا دنیا میں اور کہیں بھی ادا نہیں کی جا سکتی۔ اس نماز میں بندہ حجر اسود کو جس کو اللہ تعالیٰ کا ہاتھ کہا گیا ہے، بوسہ دے کر یا اس کو ہاتھ لگا کر بار بار اپنے رب کے ساتھ اپنے عہد اطاعت کی تجدید کرتا ہے اور پھر خانہ کعبہ کے اردگرد طواف کی دعائیں پڑھتا ہوا اس طرح چکر کرتا ہے جس طرح شمع کے اردگرد پروانہ چکر کرتا ہے تو غافل سے غافل انسان کی رُوح بھی وجد میں آ جاتی ہے۔ پھر جب آدمی خیال کرتا ہے کہ اس کی یہ نماز مشابہ ہے اس نماز سے جو فرشتے عرش الٰہی کے اردگرد پڑھ رہے ہیں تو ایک صاحب دل کے دل کی جو حالت ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے وہ حالت کسی طرح بھی لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

نماز کے بعد اسلامی عبادات میں دوسرا درجہ زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں انفاق کا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حج کے اندر انفاق کا بھی ایک نمایاں حصہ ہے۔ حج کے لیے زاد راہ کا انتظام۔ عام لوگوں کے لیے جن کی آمدنی کے ذرائع محدود ہیں، ایک بڑا مشکل مسئلہ ہوتا ہے۔ بالخصوص اس زمانہ میں تو یہ مسئلہ مشکل سے مشکل تر ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ ایک طرف وسائل سفر اور ضروریات سفر میں سے ہر چیز گراں سے گراں تر ہو گئی ہے۔ ثانیاً حجاز کی حکومت اور وہاں کے عام باشندے بھی حجاج کو اللہ کے مہمان سمجھنے کے بجائے ان کو اپنے لیے آمدنی کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں اور تمام ممکن راستے ان کو زیر بار کرنے کے اختیار کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں جو شخص حج کے لیے نکلتا ہے بالعموم اپنی آمدنی کے موجود ذرائع سے کم از کم زمانہ سفر تک کے لیے اگر بالکل نہیں تو بہت بڑی حد تک دستکش ہو کر نکلتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی اگلی اور پچھلی کمائی کا بڑا حصہ اپنی اصلاح نفس کے اس جہاد پر صرف کر دیتا ہے۔

اسی طرح حج میں روزے کی روح بھی موجود ہے۔ روزے کی اصل روح ہم بیان کر چکے ہیں کہ ترک، انقطاع اور تبتل الی اللہ ہے۔ یہ چیز حج کے اندر بدرجہ کمال موجود ہے۔ احرام میں جو پابندیاں ہیں وہ اگرچہ مدت کے اعتبار سے روزے کی پابندیوں کے مقابل میں ہلکی ہیں لیکن اپنے مزاج اور اپنی کیفیت کے لحاظ سے ان سے زیادہ سخت ہیں۔ روزے میں زہد اور درویشی کی جو جھلک ہے وہ حج میں بالخصوص حالت احرام میں اپنے اس آخری درجہ تک پہنچ جاتی ہے جس درجہ تک اسلام نے اس کو پسند کیا ہے۔ اس سے آگے رہبانیت کے حدود شروع ہو جاتے ہیں جو اسلام میں ناجائز ہے۔

نماز، انفاق اور روزہ، یہ اسلام میں مستقل عبادات کی حیثیت رکھتے ہیں اور آپ نے دیکھ لیا کہ حج میں ان سب کی روح شامل ہے۔ لیکن اسلام میں بعض ایسی عبادتیں بھی ہیں جن کا مطالبہ اسلام نے صرف خاص خاص حالات ہی کے اندر کیا ہے۔ مثلاً ہجرت اور جہاد۔ یہ عبادتیں اگرچہ ہنگامی ہیں لیکن جب ان کا وقت آ جاتا ہے تو دین میں ان کی اہمیت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ دوسری تمام عبادتوں پر ان کا پلّہ بھاری ہو جاتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حج کے اندر ان ہنگامی عبادات کی بعض شانیں بھی موجود ہیں۔

ہجرت کی اصل حقیقت فرار الی اللہ ہے یعنی بدی سے نیکی کی طرف، شر سے خیر کی طرف، اور شیطان سے رحمان کی طرف بھاگنا۔ حج میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہجرت کی یہ حقیقت بھی موجود ہے۔ جو شخص حج کے لیے نکلتا ہے اپنے گھر کو، اپنے وطن کو، اپنے اعزا و اقربا کو اور اپنے بہت سے دنیوی مفادات و تعلقات کو چھوڑ کر نکلتا ہے۔ اپنے پروردگار کی خوشنودی اور اپنے خالق و مالک کی رضا کے سوا کوئی اور غرض و غایت اس کے سامنے نہیں ہوتی۔ اگرچہ گھر اور وطن سے یہ نکلنا عام حالات میں عارضی مدت ہی کے لیے ہوتا ہے لیکن جہاں تک گناہ اور معصیت کی زندگی کا تعلق ہے اس کو ہمیشہ کے لیے بدل دینے کا عزم صمیم تو حج کی اصل حقیقت ہے اور بعینہٖ یہی حقیقت ہجرت کی بھی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ المهاجر من هجر ما نهى الله عنه (حقیقی مہاجر اللہ کے نزدیک وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے روکا ہے)

اسی طرح غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جہاد کی بھی بہت سی خصوصیات حج کے اندر موجود ہیں۔ یوں تو حج کے پورے زمانہ میں آدمی کی زندگی خدا کے ایک سپاہی کی زندگی بن جاتی ہے جو اپنا پانی کا مشکیزہ اور اپنا تھوڑا سا زاد راہ اپنے ساتھ لیے ہوئے ایک محاذ سے دوسرے محاذ پر پہنچنے کے لیے ہر وقت چاق چوبند رہتا ہے لیکن خاص کر حج کے چند دنوں کے اندر تو اس کی زندگی کو اگر تشبیہ دی جا سکتی ہے تو فی الواقع ایک مجاہد کی زندگی ہی سے دی جا سکتی ہے۔ مکہ سے منیٰ، منیٰ سے عرفات، عرفات سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے پھر منیٰ۔ دھوپ ہو، بارش ہو، ژالہ باری ہو، ہر حالت میں بہر صورت وقت معینہ پر پہنچنا ہے۔ نہ بھوک کی پروا ہے نہ پیاس کی، نہ نیند کا احساس ہے نہ سردی کا۔ نہ تکیہ کی تلاش ہے نہ بستر کی، خدا کی پسندیدہ وردی جسم پر ہے اور لبیک لبیک کی صدا زبان پر، نہ زندگی کی پروا ہے اور نہ موت کا اندیشہ، بلکہ سچ پوچھیے تو یہ بات بھی کوئی مبالغہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ عرفات اور

مزدلفہ کے میدانوں میں مرنے کی جتنی آرزو دل میں ہوتی ہے اتنی جینے کی آرزو نہیں ہوتی ۔ اس ترقی کے زمانہ میں بھی قدم قدم پر آدمی جان کے خطرے سے دوچار ہوتا ہے اور ہر سن وسال کے لوگوں کو مرتے دیکھتا ہے لیکن یہ چیزیں بالکل معمولی معلوم ہوتی ہیں بلکہ ان لوگوں پر رشک آتا ہے جو ان مقامات پر مرتے ہیں اور اپنے احرام کی دو چادروں کے ساتھ انہی پتھریلی زمینوں میں دفن کیے جاتے ہیں ۔

منیٰ میں جمرات پر جو کنکریاں ماری جاتی ہیں ان کو کوئی شخص چاہے شیطان پر کنکریاں مارنا سمجھے ، یا ابرہہ کی فوجوں پر جو آسمانی سنگباری ہوئی تھی اس کی یادگار سمجھے ۔ بہرحال یہ کنکریاں مارنا اللہ کے دشمنوں اللہ کے دین کے دشمنوں ، اسلام کے دشمنوں اور بیت اللہ کے دشمنوں پر لعنت اور سنگباری کی ایک عظیم یادگار ہے اور اللہ و رسول نے اس یادگار کو حج کے مناسک میں اسی لیے محفوظ کر دیا ہے تاکہ حج مسلمان کی روح جہاد کو بھی زندہ اور تازہ رکھے ۔

حج کی یہی خصوصیت ہے جس کے سبب سے یہ عورتوں کے لیے حقیقی جہاد کی حیثیت رکھتا ہے ۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ جھادکن الحج تمہارا جہاد حج ہے ۔

حج انسان پر ہر راہ سے اثر انداز ہوتا ہے

حج کی جامعیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان پر اثر انداز ہونے کے جتنے راستے بھی ہیں ، یہ ان تمام راستوں سے اس پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ آدمی کو سمع ، بصر اور فواد کی جو صلاحیتیں اور قابلیتیں بھی قدرت کی طرف سے عطا ہوئی ہیں ان سب کو بیدار کر دینے کے لیے اس کے اندر بہتر سے بہتر اسباب و محرکات جمع کر دیئے گئے ہیں جو معنوی اور روحانی حقیقتیں آسانی کے ساتھ انسان کی عقل کی گرفت میں نہیں آتی ہیں ان کو حج میں شعائر کی صورت میں محسوس و مشہود کر دیا گیا ہے تاکہ وہ انسان کے حواس کی گرفت میں آسکیں ۔ حج کے مناسک سے یکے بعد دیگرے گذرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کی پوری تاریخ اپنے تمام آثار و نشانات کے ساتھ آدمی کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے ۔ یہ گھر ہے جس کو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ نے خود اپنے مبارک ہاتھوں سے بنایا ، یہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمازیں پڑھیں ، یہ پہاڑی ہے جس کے دامن میں باپ نے اپنے محبوب بیٹے کی قربانی کی ، یہ میدان ہیں جہاں انہوں نے دعوت الی اللہ کے خطبے دیئے اور جس کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اور جس کی تپتی ہوئی ریتوں پر انہوں نے دعائیں اور مناجاتیں کیں ۔ یہ ساری چیزیں ایک ایک کر کے صرف حافظہ ہی میں نہیں تازہ ہو جاتی ہیں بلکہ نگاہوں کے

سامنے بھی آجاتی ہیں جن چیزوں کے ذکر اب تک صرف بزرگوں کی زبانی ہی سنے تھے یا صرف کتابوں کے صفحات ہی میں پڑھے تھے ان کو آنکھوں سے بھی دیکھ لیتے ہیں ۔ اس وقت فی الواقع آدمی کو اندازہ ہوتا ہے کہ جس نے کہا ہے کہ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" اس نے کتنی سچی بات کہی ہے ۔

بسا اوقات ان مقامات و مناسک سے گذرتے ہوئے جب آدمی کو یہ خیال آجاتا ہے کہ کیا عجب کہ جہاں وہ اس وقت کھڑا ہے عین اسی جگہ کبھی حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہ السلام بھی کھڑے ہوئے ہوں یا جس جگہ وہ سجدہ کر رہا ہے اس جگہ کو ان کے سجدوں کی تقدیس بھی حاصل ہوئی ہو تو اس وقت کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ قیام کیا چیز ہے اور سجدہ کس چیز کو کہتے ہیں ۔

پھر اس سے زیادہ موثر ہمارے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے آثار و مقامات ہوتے ہیں ۔ آدمی چپہ چپہ پر ان کے نشانات اور ان کے کارناموں کو ثبت دیکھتا ہے ۔ جس شہر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے جس کی گلیوں اور جس کے کوچوں میں آپ دعوت حق لے کر پھرے جس کے حرم میں آپ نے نمازیں پڑھیں جس کی پہاڑیوں میں آپ کے موذن کی اذانیں گونجیں ، جہاں آپ نے اللہ کے دین کی خاطر طرح طرح کی تکلیفیں جھیلیں جس محبوب شہر کو اللہ کے لیے آپ نے چھوڑا اور پھر جس شہر کو آپ نے اپنی دعوت کا مرکز بنایا جن میدانوں اور پہاڑوں میں آپ نے اور آپ کے صحابہ نے اعلائے حق کے لیے جنگیں کیں ، یہ ساری چیزیں ایک ایک کر کے جب انسان کی نگاہوں کے سامنے آتی ہیں تو اسلام کی پوری تاریخ اس طرح اس کے سامنے مشہود ہو جاتی ہے گویا اس کے اور اسلام کے دور اول کے درمیان زمان و مکان کا کوئی پردہ اب سرے سے حائل ہی نہیں رہا ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ اس عبادت کا انسان پر جو اثر پڑتا ہے وہ کسی بھی دوسری عبادت کا نہیں پڑتا اور پھر بالکل اسی کے برابر کی دوسری حقیقت یہ ہے کہ جو شخص حج سے محروم ہوتا ہے پھر اس کی اصلاح کسی بھی دوسری چیز سے نہیں ہوتی ۔ اسلام میں اس کی حیثیت روحانی امراض کے آخری علاج کی ہے جس کو اس سے فائدہ نہیں ہوا اس کے لیے کوئی دوا بھی نافع نہیں ہوگی ۔

یہاں پہلے ہم اس کی برکتیں بیان کریں گے ، اس کے بعد اس کی آفات اور ان کے علاج سے بحث کریں گے ۔

حج کی برکتیں

روحانی کایا کلپ

جس طرح جسمانی امراض کے علاج کی قسموں میں علاج کی ایک قسم وہ ہے جس کو کایا کلپ کہتے ہیں اسی طرح روحانی امراض کے علاج کے لیے حج ہے ۔ یہ علاج کا ایک ایسا کورس ہے جس کو اگر اس کے تمام شرائط

کے ساتھ کوئی شخص آخر تک نباہ لے جائے تو وہ تمام روحانی بیماریوں سے صحت یاب ہو کر ٹھیک اس فطرۃ اللہ پر پہنچ جاتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے اور جس پر وہ چاہتا ہے کہ یہ مرے۔ یہ حقیقت متعدد حدیثوں سے واضح ہوتی ہے لیکن ہم اختصار کے خیال سے صرف ایک حدیث کا ترجمہ بیان دیتے ہیں جو بخاری اور مسلم دونوں میں ہے:

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جس نے حج کیا اور اس دوران میں نہ اس نے کوئی شہوت کی بات کی اور نہ خدا کی کسی نافرمانی کا ارتکاب کیا وہ تمام گناہوں سے اس طرح پاک و صاف ہو گیا جس طرح وہ اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔"

جنت کی ضمانت حج چونکہ اسلام اور ہجرت کی طرح آدمی کے تمام گناہوں کو فنا کر دیتا ہے اس وجہ سے اس شخص کے لیے جس کو حج مبرور کی سعادت حاصل ہو جائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کی ضمانت ہے۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک عمرہ کے بعد آدمی اگر دوسرا عمرہ کرے تو یہ عمرہ درمیان کے تمام گناہوں کے لیے کفارہ بن جاتا ہے اور حج مبرور کا صلہ تو جنت سے کم کچھ ہے ہی نہیں۔" (متفق علیہ)

حج مبرور سے مراد وہ حج ہے جو اللہ تعالیٰ کی کسی نافرمانی کی آلودگی سے پاک ہو۔ اس حج کے متعلق حضورؐ فرماتے ہیں کہ اس کی جزا جنت سے کم کچھ ہے ہی نہیں۔

تجدید عہد حج کے ذریعہ سے بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے اس عہد کو از سر نو استوار کر لیتا ہے جو ایک مسلم کی حیثیت سے اس نے اپنے رب سے کیا ہے۔ یہ تجدید عہد اگرچہ ہر توبہ و استغفار سے ہوتی رہتی ہے لیکن اس تجدید عہد کا جو عزم و ارادہ حج میں ظاہر ہوتا ہے وہ عام توبہ و استغفار میں نہ ظاہر ہوتا ہے اور نہ ظاہر ہو سکتا ہے۔ آدمی اس تجدید عہد ہی کے لیے رخت سفر باندھتا ہے اور ایک طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے اپنے رب کے دروازے پر حاضری دیتا ہے۔ یہ گھر سے نکلنا اور اس مقصد کے لیے سفر کرنا ہی بجائے خود ایک بہت بڑی چیز ہے۔ یہ بندے کے اخلاص اور اس کی صدق طلبی کا ایک نہایت واضح نشان ہے اور اس سے خدا کی رحمت اس کے لیے جوش میں آتی ہے۔

پھر جب وہ حجر اسود کو بوسہ دیتا ہے یا اس کو ہاتھ لگاتا ہے تو گویا خدا کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اپنے عہد بندگی و اطاعت کی تجدید کرتا ہے۔

اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی جگہ پر پہنچ کر ان کی قربانی کی سنت کو تازہ کرنا درحقیقت اپنی زندگی کو از سر نو خدا کی نذر کرنا ہے۔ کیونکہ قربانی کی اصل حقیقت اپنے آپ کو خدا کی حوالگی اور سپردگی میں دے دینا ہے

اور یہی حقیقت اسلام کی بھی ہے۔ اسلام کے معنی اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینے کے ہیں یعنی خدا کی مرضی اور اس کی پسند کے آگے آدمی کی اپنی کوئی مرضی اور اپنی کوئی پسند باقی نہ رہ جائے۔ آدمی اپنی محبوب سے محبوب اور عزیز سے عزیز چیز بھی خدا کے لیے ہر وقت قربان کر دینے کے لیے تیار رہے۔ اس حقیقت کو واقعہ کی شکل میں اور اس فلسفہ کو عمل کے جامہ میں پوری تاریخ انسانی میں جس نے پیش کیا ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ انھوں نے اپنے محبوب بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو خدا کے لیے قربان کر دینے کا عزم بالجزم ظاہر کر کے یہ ثابت کر دیا کہ فی الواقع انھوں نے اپنا سب کچھ بغیر کسی استثنا اور تحفظ کے خدا کے حوالہ کر دیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ اقدام اللہ تعالٰے کو اتنا پسند آیا کہ اس نے ان کو مسلم کے لقب سے نوازا اور جس بیٹے کو انھوں نے قربان کیا اس کی نسل سے ایک امت مسلمہ برپا کی جس کی خاص خصوصیت یہ ٹھہرائی کہ وہ دین اسلام کی حامل بنے اور اس اسلام کی اصل حقیقت کو اپنے اندر برابر زندہ اور تازہ رکھنے کے لیے اس ابراہیمی قربانی کی یادگار منائے۔ اسی قربانی کی یادگار ہے جس کو حج کے مناسک میں شامل کیا گیا ہے۔ جو اللہ کے بندے اس مقدس قربان گاہ تک پہنچ پاتے ہیں وہ وہاں پہنچ کر اس قربانی کی سعادت حاصل کرتے ہیں جو مشکلات اور موانع کے سبب سے وہاں نہیں پہنچ پاتے وہ اپنی اپنی بستیوں ہی میں اس قربانی کی یادگار مناتے ہیں تاکہ ان کے اندر اسلام کی اصل حقیقت کا شعور بھی زندہ رہے اور ان کی طرف سے ان کے اس عمل سے اس بات کا اظہار بھی ہوتا رہے کہ وہ اصل قربان گاہ پر پہنچ کر اس قربانی کی سعادت حاصل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔

اس قربانی کی اصل حقیقت خدا کی راہ میں جان کی قربانی ہے لیکن اللہ تعالٰے نے محض اپنے فضل اور اپنی مہربانی سے ہمیں اس کا موقع دیا ہے کہ ہم اپنی طرف سے کسی جانور کی قربانی کر کے اپنی جان کا فدیہ ادا کر دیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالٰے کی طرف سے ہمارے لیے ایک بہت بڑی رعایت ہے اور اس نے جو جانور ہماری خدمت کے لیے پیدا کیے ہیں جب وہ خدا کی راہ میں ہمارے بدل کی حیثیت سے قربان ہوتے ہیں تو یہ سب سے بڑی خدمت ہے جو ہماری وہ انجام دیتے ہیں اور یہ سب سے زیادہ اشرف مقصد ہے جس پر ہم ان کو استعمال کرتے ہیں۔ جو لوگ ہر چیز کو صرف معاشی پیمانوں سے ناپتے ہیں، وہ ان چیزوں کی قدر و قیمت نہیں سمجھتے اس وجہ سے ان پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھیڑوں بکریوں کی قدر و قیمت حضرت ابراہیمؑ کی قربانی سے زیادہ ہے۔

غرض حج کے موقع پر ان میں سے ایک ایک چیز سے بندہ اپنے آپ کو اس حیثیت میں پیش کرتا ہے کہ

گویا وہ ایک مفرور غلام تھا اور اب وہ پھر اپنے مالک و آقا کے دروازے پر از خود حاضر ہوا ہے تاکہ اس کے ساتھ اپنے عہد غلامی کو از سر نو استوار کرے اور ہمیشہ اس کی فرمانبرداری اور اطاعت کرتے رہنے کا اقرار کرے۔

امت کی وحدت کا مظاہرہ اوپر ہم نے حج کی جو برکتیں بیان کی ہیں یہ افراد کو ان کی انفرادی حیثیت میں حاصل ہوتی ہیں لیکن حج کے اندر بعض نہایت اہم اجتماعی برکتیں بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ صرف حج ہی کا ایک موقع ایسا موقع ہے جس میں یہ حقیقت سورج سے بھی زیادہ روشن ہو کر ہر شخص کے سامنے آجاتی ہے کہ اس امت کے مختلف اجزا کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے والی اور ان کو بنیان مرصوص بنانے والی چیز درحقیقت کیا ہے؟ زبانیں مختلف، رنگ مختلف، قومیتیں اور جنسیتیں مختلف، امصار و بلاد مختلف، ذوق اور طبائع مختلف، لباس مختلف، حد یہ ہے کہ نمازیں ادا کرنے کے طریقے بھی بعض ظواہر میں ایک دوسرے سے مختلف، لیکن لبیک لبیک کی صدا سب کی زبانوں پر، احرام کی چادریں سب کے جسموں پر، بیت اللہ پر نثار سب پروانہ وار، ایک ہی امام کی اقتدا میں بیت اللہ کے اردگرد سب مصروف رکوع و سجود۔ اختلاف کے اندر وحدت کا اور گوناگونی و بوقلمونی کے ساتھ ہم آہنگی و ہم رنگی کا جو مظاہرہ حج میں ہوتا ہے وہ صرف حج کے ساتھ مخصوص ہے جس کو حج کی سعادت حاصل نہ ہوئی ہو وہ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ (باقی)

بقیہ اسلامی قانون کے ماخذ

ایسی حدیثیں بھی ملتی ہیں جو ایک شخص کی سمجھ میں نہیں آتیں یا اس کو وہ بعید از عقل و قیاس معلوم ہوتی ہیں یا ان کی زد، اس کے خیال میں، اسلام کے کسی اصول پر پڑتی ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ ان کی تاویل کرے اگر کوئی تاویل بن سکے، اگر تاویل نہ ہوسکے تو ان کے بارہ میں خاموشی کی روش اختیار کرے، ممکن ہے ان کا صحیح پہلو اس کے سامنے نہ آرہا ہو۔ اگر خاموشی کی روش بھی اختیار نہ کرسکے تو اپنے اعتراض کو اسی حدیث یا انہی احادیث تک محدود رکھے جن کے اندر کسی واضح خرابی کی وہ نشان دہی کرسکتا ہے۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ آدمی خرابی تو دو یا چار حدیثوں میں دکھائے لیکن ان کی آڑ میں مطعون سارے ذخیرہ احادیث کو کرے۔ حدیث کی مستند سے مستند کتابوں کی بعض حدیثوں پر اہل علم نے پہلے بھی تنقیدیں کی ہیں لیکن کسی معقول آدمی نے یہ حرکت کبھی نہیں کی کہ وہ ان قابل تنقید حدیثوں کی بنا پر سارے ذخیرہ احادیث ہی کو سوختنی قرار دے دے۔ یہ حرکت وہی لوگ کرسکتے ہیں جو یا تو علوم کے ان بیش بہا خزانوں سے بالکل بے خبر ہیں جو احادیث کی کتابوں کے اندر موجود ہیں یا ان کو ایمان اور ہدایت کے راستہ سے شیطان کی طرح بیر ہے۔

(باقی)

اسلامی قانون

امین احسن اصلاحی

اسلامی قانون کے ماخذ

ہمارے اصول فقہ کے علماء اسلامی قانون کے عموماً چار ماخذ بتاتے ہیں: کتاب، سنت، اجماع اور قیاس۔ مسئلہ کی یہ تعبیر اگرچہ غلط نہیں ہے لیکن اس تعبیر میں بعض ایسے خلا ہیں جن کے سبب سے موجودہ زمانے کے ذہنوں کو اصل حقیقت کے سمجھنے میں بعض الجھنیں پیش آتی ہیں۔ میں پہلے اس تعبیر کے خلا کی طرف اشارہ کروں گا تاکہ وہ الجھنیں دور ہوسکیں جو اس تعبیر کے سبب سے ذہنوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے بعد تفصیل کے ساتھ بتاؤں گا کہ اسلامی قانون کے ماخذ فی الواقع کیا کیا ہیں، ان ماخذوں کے حدود کیا ہیں اور ان سے استفادہ کے شرائط کیا ہیں؟

مذکورہ تعبیر میں کھٹکنے والی باتیں دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں اجماع کو تیسرے ماخذ قانون کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے حالانکہ کتاب اور سنت کے بعد تیسرا ماخذ اسلام میں اجتہاد ہے۔ اجماع اجتہاد کی ایک قسم بلکہ سب سے اعلیٰ قسم تو ضرور ہے لیکن اس کو تیسرے ماخذ قانون سے تعبیر کرنا اس عہد کے بہت سے لوگوں کو کچھ اجنبی سا معلوم ہوتا ہے۔ اجتہاد ایک تو کسی مجتہد کا انفرادی اجتہاد ہوتا ہے، ایک وہ اجتہاد ہوتا ہے جس پر وقت کے مجتہدین متفق ہوگئے ہوں۔ اس موخر الذکر اجتہاد کو اجماع کہتے ہیں یہ سابق الذکر اجتہاد سے اس اعتبار سے بالکل مختلف ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت صرف ایک رائے کی نہیں رہ جاتی بلکہ یہ دین میں بجائے خود ایک حجت کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔

اس میں دوسری کھٹکنے والی چیز یہ ہے کہ قیاس کا ایک چوتھے ماخذ قانون کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے حالانکہ قیاس بجائے خود اصل ماخذ قانون نہیں ہے بلکہ اسلام کے تیسرے ماخذ قانون — اجتہاد — کے مختلف طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے جس کا مقصد اگر فنی اصطلاحات و تعبیرات سے الگ ہوکر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش آئے ہوئے کسی قضیہ یا معاملہ کو سامنے رکھ کر اپنے سامنے پیش آئے ہوئے کسی معاملہ میں شریعت کا حکم معلوم کرنے کی کوشش کرنا۔

ہمارے علمائے اصول نے اجتہاد ہی کو اجماع اور قیاس کے دو لفظوں سے تعبیر کر دیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی ہوگی کہ اجتہاد کا لفظ جامع تو ضرور ہے لیکن اپنی وسعت کی وجہ سے پوری طرح واضح نہیں ہے۔ اجماع اور قیاس سے اس کی تعبیر ایک حد تک اس کو گرفت میں لا دیتی ہے۔ اجماع سے اس وجہ سے کہ یہ اجتہاد کی سب سے اعلیٰ قسم ہے اور قیاس سے اس بنا پر کہ اجتہاد کے طریقوں میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا طریقہ یہی ہے۔ اگرچہ اس تعبیر کے لیے یہ ایک وجہ جواز موجود ہے لیکن میرے نزدیک صحیح اور جامع تعبیر اجتہاد ہی کی تعبیر ہے۔ معاذ بن جبلؓ والی حدیث میں بھی کتاب و سنت کے بعد تیسری چیز جس کا ماخذ قانون کی حیثیت سے ذکر آیا ہے وہ اجماع یا قیاس نہیں ہے بلکہ اجتہاد ہی ہے۔

مذکورہ بالا تعبیر میں دوسری کھٹکنے والی بات یہ ہے کہ یہ اسلامی قانون کے تمام ماخذوں کا پورا پورا احاطہ نہیں کرتی۔ اسلامی قانون کے ماخذوں میں سے ایک ماخذ عرف (رواج) بھی ہے جو ایک مخصوص دائرہ میں معتبر ہے اور اس کا معتبر ہونا قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور فقہانے بھی اس کو تسلیم کیا ہے لیکن مذکورہ چاروں ماخذوں کے ساتھ اس کا کوئی حوالہ نہیں آتا۔ اسی طرح اسلامی قانون کے ماخذوں میں سے ایک ماخذ مصلحت بھی ہے اور یہ بھی ایک خاص دائرہ ہے اور ہمارے فقہانے اس کو بھی تسلیم کیا ہے لیکن اس کا بھی ان چاروں کے ساتھ کوئی ذکر نہیں آتا۔ میرا خیال ہے کہ ان کے نظرانداز کیے جانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں ماخذ اصل ماخذ نہیں بلکہ ضمنی ماخذ ہیں اور ان کے دائرے کتاب و سنت اور اجتہاد کے دائروں سے الگ ہیں اس وجہ سے علمانے ان کا ذکر تو کیا لیکن اسلامی قانون کے اصل ماخذوں سے الگ کر کے کیا۔ اگرچہ ان کے ذکر نہ کرنے کی یہ وجہ موجود ہے اور مجھے اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہے لیکن قانون اسلامی کے اصل ماخذوں کے ساتھ ان کا ذکر نہ آنے سے اسلامی قانون کے ماخذوں کا پورا تصور ذہن میں نہیں آتا۔

اسلامی قانون کے ۵ ماخذ

میں پچھلے علماء کی اس تعبیر کو اگرچہ حکمت سے خالی نہیں سمجھتا لیکن بات کو موجودہ زمانہ کے ذہن سے قریب تر لانے کے لیے یوں کہنا میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے کہ اسلامی قانون کے پانچ ماخذ ہیں۔ کتاب، سنت، اجتہاد، رواج اور مصلحت۔

ان میں ترتیب الاقدم فالاقدم کی ہے یعنی جو پہلے ہے اس کی طرف پہلے رجوع کیا جائے گا، اس کو نظرانداز کر کے دوسرے کا اعتبار اور لحاظ نہیں ہوگا۔ مثلاً اسلامی قانون کا پہلا ماخذ قرآن ہے۔ اس وجہ سے ہر معاملہ میں سب سے پہلے اسی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اگر کسی معاملہ میں قرآن خاموش ہوگا تو پھر سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اسی طرح اجتہاد سے کام اس صورت میں لیا جائے گا جب کتاب و سنت کے نصوص میں کوئی رہنمائی نہ ملے۔ علیٰ ہذا القیاس رواج اور مصلحت کا لحاظ انہی صورتوں میں ہوگا جن میں کتاب و سنت نے ہمیں رواج اور مصلحت پر عمل کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔

[نہ]یں کریں گے کہ کتاب کو نظرانداز کر کے کسی معاملہ میں حدیث کو اختیار کر لیں یا سنت کو پس پشت ڈال کر رواج یا مصلحت کو ماخذ قانون بنا لیں۔ چنانچہ جہاں تک ترتیب کا تعلق ہے معاذ بن جبلؓ والی مشہور حدیث میں بھی ترتیب بیان ہوئی ہے۔ اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے:

"معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو یمن بھیجنے لگے تو آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ جب تمہارے سامنے کوئی معاملہ فیصلہ کے لیے پیش ہوگا تو تم اس کا فیصلہ کس طرح کرو گے؟ میں نے عرض کی کہ میں اس کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اللہ کی کتاب میں اس کے متعلق کوئی بات نہ ملے تو کیا کرو گے؟ میں نے کہا کہ پھر اس کا فیصلہ رسول اللہ کی سنت کے مطابق کروں گا۔ پھر حضور نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ کی سنت میں بھی اس کے متعلق کوئی بات نہ ملے تو کیا کرو گے؟ میں نے عرض کیا کہ پھر میں اجتہاد کر کے اپنی رائے متعین کرنے کی کوشش کروں گا اور اس کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری یہ بات سنی تو میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ اس اللہ کا شکر ہے جس نے اللہ کے رسول کے نمائندے کو اس بات کی توفیق دی جو اللہ کے رسول کو پسند ہے۔"

اس حدیث سے وہ بات بھی واضح ہوتی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے کہ اسلامی قانون کا تیسرا ماخذ درحقیقت اجتہاد ہے جس کے دو اہم رکن اجماع اور قیاس ہیں۔ اور ان ماخذوں کی وہ ترتیب بھی واضح ہوتی ہے جس کی طرف ہم نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے۔ اس وجہ سے صحیح بات میرے نزدیک یہ ہے کہ نہ قرآن کو حدیث منسوخ کر سکتی اور نہ سنت کو اجتہاد منسوخ کر سکتا۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے میرے نزدیک ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔ صحیح رائے میرے نزدیک اس بارہ میں حدیث کے سب سے بڑے واقف حال حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ سنت کتاب اللہ کے خلاف فیصلہ کرسکتی ہے۔ سنت تو کتاب اللہ کی تفسیر اور اس کی وضاحت کرتی ہے .... سنت قرآن کی کسی چیز کو منسوخ نہیں کرسکتی۔ قرآن کو صرف قرآن ہی منسوخ کرسکتا ہے۔"

یہی مذہب امام شافعیؒ اور جمہور اصحاب مالک کا ہے۔ جب سنت قرآن کو نہیں منسوخ کرسکتی تو ظاہر ہے کہ عرف یا مصلحت کے سنت یا اجتہاد پر اثر انداز ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اب میں مختصر طور پر ان پانچوں ماخذوں پر کچھ الگ الگ روشنی ڈالوں گا۔

کتاب اللہ

اس بات پر پوری امت کا اتفاق ہے کہ اسلامی قانون کا پہلا ماخذ کتاب اللہ ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے اب اس سے آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرنا شروع کردیا ہے کہ اسلامی قانون کا واحد ماخذ کتاب اللہ ہے۔ یہ بات صریحاً غلط ہے۔ قرآن اسلامی قانون کا واحد ماخذ نہیں ہے بلکہ سب سے اہم اور سب سے مقدم ماخذ ہے۔ قرآن خود اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ وہی تنہا ماخذ قانون ہے بلکہ وہ جس طرح اپنی پیروی اور اطاعت پر زور دیتا ہے اسی طرح رسول کی پیروی اور اطاعت پر بھی زور دیتا ہے اور صاف الفاظ میں یہ اعلان کرتا ہے کہ رسول تمہیں جس بات کا حکم دیں اس کو کرو اور جس بات سے روکیں اس سے رک جاؤ۔ اسی طرح اجتہاد اور عرف و مصلحت وغیرہ کا اسلامی قانون میں جس حد تک اعتبار ہے قرآن اس کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے۔

قرآن کے اولین ماخذ قانون اسلامی ہونے کا صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک میں یہ اثر تھا کہ ان کے اندر سب سے زیادہ عزت و احترام کے مستحق وہی لوگ سمجھے جاتے تھے جو قرآن کے علم و فہم میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ مجال نہیں تھی کہ کوئی مسئلہ دین و شریعت سے متعلق اٹھے اور یہ سوال سب سے پہلے ہر شخص کے سامنے نہ آئے کہ اس بارہ میں کتاب اللہ کیا رہنمائی دیتی ہے۔ جب تک یہ بات طے نہیں ہوجاتی تھی کہ اس امر میں کتاب اللہ خاموش ہے اس وقت تک کسی دوسری چیز کی طرف رجوع کرنے کا سرے سے سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

قرآن سے قانون اور اصول زندگی اخذ کرنے کے مدعی تو اس زمانہ میں بہت سے پیدا ہوگئے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن سے قانون اخذ کرنا اتنا سہل نہیں ہے جتنا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ اس کام کو صحیح طور پر انجام دینے کے لیے کچھ شرطیں ہیں جو ہر شخص پوری نہیں کرسکتا اور جو شخص یہ شرطیں پوری نہیں کرسکتا

وہ اگر قرآن کا مفسر بن بیٹھے گا تو وہ اللہ کے دین کو بازیچۂ اطفال بنانے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں کرسکے گا۔ میں ان شرطوں کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

۱۔ جو شخص قرآن کا مطالعہ فقہی اور قانونی نقطۂ نظر سے کرنا چاہے اسے سب سے پہلے یہ بات نگاہ میں رکھنی چاہیے کہ قرآن مجید قانون اور فقہ کی کتابوں کے طرز پر مرتب نہیں ہے بلکہ اس کی ترتیب ایک دوسرے اصول پر مبنی ہے۔ اس کے اندر عقائد، ایمانیات، اخلاق، موعظت، قصص اور امثال سب ملے جلے بیان ہوئے ہیں۔ ان مختلف اقسام کی چیزوں کے اندر سے ان چیزوں کو چھانٹنا جو قانونی قدر و قیمت رکھتی ہیں اور ان کا صحیح صحیح درجہ متعین کرنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جو قرآن کے ان سارے پہلوؤں سے واقف ہو اور دین میں ان میں سے ہر چیز کا جو مقام ہے اس کو جانتا ہو۔ قرآن کا لفظ لفظ دریائے معانی ہے اور قانون میں ایک ایک نقطہ اور ایک ایک شوشہ کی جو اہمیت ہوتی ہے وہ معلوم ہے۔ جو شخص قرآن کے ان ذکر کردہ پہلوؤں میں امتیاز نہ کرسکتا ہو اور اس کے ایک ایک لفظ کا پورا پورا حق ادا نہ کرسکتا ہو اس کے لیے اس سے قانون اخذ کرنا اور اس کے حدود کو صحیح صحیح متعین کرنا ناممکن ہے۔

۲۔ دوسری چیز یہ ہے کہ اس کام کے لیے قرآن کی زبان کا گہرا علم ضروری ہے۔ صرف عام مروجہ عربی زبان کا علم نہیں بلکہ اس زبان کا علم جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے۔ جو لوگ قرآن کے زمانۂ نزول کے عربی ادب کے ذوق آشنا نہیں ہیں ان کے لیے قرآن کی بہت سی خوبیوں اور باریکیوں کو سمجھنا ناممکن ہے۔ بالخصوص قانون میں چونکہ حروف، الفاظ، اسلوب، ترکیب اور تقدیم و تاخیر سب چیزوں کی، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے، اہمیت ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے لیے قرآن کا وہ مطالعہ ہرگز کافی نہیں ہوتا جو اس کے ترجموں یا تفسیروں کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ ترجموں اور تفسیروں کی مدد سے جو مطالعہ کیا جاتا ہے وہ صرف حصول برکت یا زیادہ سے زیادہ اس مقصد کے لیے ہوسکتا ہے کہ آدمی قرآن کی عام تعلیم و ہدایات اور عام موعظت و نصیحت سے کچھ فائدہ اٹھالے۔ مطالعہ، تحقیق و تدقیق اور قانون اور حکمت کے نکات سمجھنے کے لیے ہرگز کارآمد نہیں ہے۔ اس زمانہ میں قرآن حکیم پر یہ ظلم عام ہے کہ جو لوگ اس کی زبان کی ابجد تک سے ناآشنا ہیں وہ اس کی تفسیریں لکھ رہے ہیں اور جو لوگ اس کی آیات کی صحیح طور پر تلاوت بھی نہیں کرسکتے وہ اس کے نکتے بیان کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ان نکات تک ان کے سوا نہ سلف میں سے کسی کی رسائی ہوئی اور نہ خلف میں سے کوئی ان کو پاسکا۔

۳۔ تیسری چیز یہ ہے کہ آدمی ملتِ ابراہیمی کے بقایا، عرب کے معروف و منکر، ملتِ موسوی اور ملتِ عیسوی کے

احکام و قوانین سے بھی فی الجملہ واقف ہو۔ ان چیزوں سے ایک حد تک باخبر ہونا اس لیے ضروری ہے کہ قرآن ان میں سے بعض کی تصدیق کرتا ہے، بعض کی تردید کرتا ہے، بعض کو نظر انداز کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور بعض کو ترقی دیتا ہے۔ اگر آدمی ان سے واقف نہ ہو تو نہ قرآن کی ترمیمات و اصلاحات کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتا، اور نہ دین کامل کے احکام و قوانین میں جو حکمتیں ہیں ان کو صحیح طور پر سمجھ سکتا۔ اسی چیز سے دین میں نسخ کی ضرورت اور اس کی حکمت سمجھ میں آتی ہے کیونکہ اسی چیز نے درحقیقت دین کی تدریجی ترقی کے تقاضوں ہی کے تحت دین میں جگہ پائی ہے۔

۴۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ آدمی اس حقیقت سے باخبر ہو کہ اسلامی معاشرہ کی تدریجی ترقی کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون کس طرح درجہ بدرجہ ظہور میں آیا ہے۔ اسلامی شریعت کی اس تدریج سے جو شخص واقف نہ ہو وہ نہ صرف یہ کہ اس کے نظام کی بہت سی حکمتوں سے واقف نہیں ہو سکتا بلکہ وہ اس کے نفاذ کے بہت سے عملی تقاضوں کو بھی سمجھ نہیں سکتا۔ جو لوگ کسی بگڑے ہوئے معاشرہ میں اس کو ازسرِنو نافذ کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہوں وہ اگر اسلامی قانون کی اس ترتیب اور تدریج سے اچھی طرح واقف نہ ہوں تو بہت ممکن ہے کہ وہ اس کے سر کو اس جگہ رکھ دیں جس جگہ اس کا پاؤں ہونا چاہیے اور اس کے پاؤں کو اس جگہ رکھنے کی کوشش کریں جہاں اس کا سر ہونا چاہیے تھا، اور اس طرح اپنی اس بے تدبیری کی بدولت اس کے نفاذ ہی کو ناممکن بنا دیں۔

سنت رسول اللہ

اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ جس طرح پوری امت کا ہمیشہ اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ اسلامی قانون کا پہلا ماخذ کتاب اللہ ہے اسی طرح ہمیشہ اس بات پر بھی اتفاق رہا ہے کہ اس کا دوسرا ماخذ سنت رسول اللہ ہے۔

لیکن اس بات کو یاد رکھیے کہ میں نے سنت کا لفظ استعمال کیا ہے، حدیث کا لفظ نہیں استعمال کیا ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو کتاب اللہ کے بعد اپنی جس چیز کے اختیار کرنے اور اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے کا حکم دیا ہے اس کو سنت ہی کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سنت اور حدیث میں تھوڑا سا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ثابت شدہ طریقہ کو کہتے ہیں اور حدیث ہر وہ قول یا فعل یا تقریر ہے جس کی روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کے ساتھ کی جائے۔ عام اس سے کہ وہ ثابت شدہ ہو یا اس کا ثابت شدہ ہونا محلِ نزاع ہو، حدیث حسن

صحیح، ضعیف، موضوع اور مقلوب سب کچھ ہو سکتی ہے لیکن سنت کے متعلق یہ بحثیں نہیں پیدا ہوتیں۔

سنت کے متعلق اس زمانہ میں بعض لوگ دو اعتراض اٹھاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے معلوم کرنے کا کوئی معتبر ذریعہ نہیں ہے۔ وہ اپنے اس اعتراض کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سنت کے معلوم کرنے کا واحد ذریعہ حدیث کی کتابیں ہیں اور حدیث کی کتابوں میں سے کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں ہے جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ وہ صحت کے معاملہ میں قرآن کی طرح ہر شبہ سے بالاتر ہے۔ پھر وہ اس سے یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ جب حدیث کی کوئی کتاب بھی شبہ سے بالاتر نہیں ہے تو دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ سنت کے معلوم کرنے کے سارے ذرائع مشتبہ ہیں۔

دوسرا اعتراض یہ معترضین یہ اٹھاتے ہیں کہ سنت کے بارہ میں مسلمانوں میں اختلاف رائے ہے، اس کی کوئی واضح اور متفق علیہ تعریف موجود نہیں ہے۔ ایک ہی چیز کے بارہ میں ایک گروہ کے نزدیک سنت کچھ اور ہے اور دوسرے کے نزدیک کچھ اور۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں اعتراضات بے بنیاد ہیں۔

جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے وہ درحقیقت دو مغالطوں پر مبنی ہے۔ ایک مغالطہ تو ان معترضین کو یہ ہے کہ حدیث کی کتابیں اگر قرآن کی طرح شبہ سے بالاتر نہیں ہیں تو لازماً وہ ان کے نزدیک جھوٹی ہیں۔ دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ سنت کے معلوم ہونے کا ذریعہ ان کے خیال میں صرف حدیث کی کتابیں ہی ہیں۔

یہ دونوں مغالطے اگر بالارادہ پیدا نہیں کیے گئے ہیں تو ہمارے نزدیک محض علم کی کمی اور صحیح صورت حال سے بے خبری کا نتیجہ ہیں۔

حدیث کی کتابوں میں سے کوئی کتاب قرآن مجید کی طرح غلطی کے امکانات سے تو بلاشبہ بری نہیں ہے لیکن غلطی کے امکانات سے بری نہ ہونے کے یہ معنی سمجھ لینا کہ حدیث کی کوئی کتاب سرے سے قابل اعتبار ہی نہیں ہے، کم عقلی کی آخری حد ہے۔ حدیث کی کتابوں کے متعلق یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ وہ غلطی کے امکانات سے محفوظ نہیں ہیں تو یہ بات قرآن کو مقابلہ میں رکھ کے کہی جاتی ہے یعنی یہ اس معنی میں غلطی سے محفوظ نہیں ہیں جس معنی میں قرآن غلطی کے ہر امکان سے محفوظ ہے۔ عام کتابوں کے مقابلہ میں یہ بات نہیں کہی جاتی۔ قرآن کی حفاظت کا انتظام ہر پہلو سے خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کام نقص اور خرابی کے ہر شائبہ سے پاک ہوتا ہے۔ برعکس اس کے حدیث کی حفاظت کا انتظام غیر معصوم انسانوں نے کیا ہے۔ اسی وجہ سے

اس کے متعلق عصمت کا دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن کسی چیز کے ہم پایۂ قرآن قرار نہ پا سکنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ ساقط الاعتبار ہے۔ اس کمی کے باوجود جو قرآن کے مقابل میں حدیث کی صحت کے اہتمام میں پائی جاتی ہے، یہ ایک حقیقت ہے جس کا کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ حفاظت کا جو اہتمام اس علم کو حاصل ہوا ہے آج تک دنیا میں وہ اہتمام کسی علم کو بھی نہ حاصل ہوا اور نہ آئندہ ہوگا۔ دنیا میں یہی ایک علم ہے جس کے نقل و روایت میں صحت کو اس درجہ اہمیت دی گئی کہ باقاعدہ اس کے لیے روایت، اسناد اور جرح و تعدیل کا ایک عظیم الشان فن وجود میں آگیا۔ جس کسی نے بھی کسی حدیث کے روایت کرنے کی جرأت کی فوراً اس کی ساری زندگی ائمۂ فن کے نزدیک موضوعِ بحث بن گئی۔ اس کا اخلاق کیسا تھا، اس کے تعلقات و معاملات کس طرح کے لوگوں سے تھے، اس کے عقائد و نظریات کیا تھے، اس کے استاذ اور شیخ کون کون تھے اور اخلاق و عادات اور عقائد و نظریات کے لحاظ سے ان کا حال کیا تھا؟ نیز ذہن اور حافظہ کے لحاظ سے اس کا جوانی اور بڑھاپے دونوں زمانوں میں کیا حال رہا؟ یہ سارے سوالات اس کے متعلق اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور اگر کسی پہلو سے بھی اس میں کسی خرابی کی شہادت ملتی تھی تو یہ خرابی اس کی روایت کی حیثیت کو مجروح کر دیتی تھی۔

جو علم اس اہتمام کے ساتھ مرتب ہوا ہے عقل اور فطرت تقاضا کرتی ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے نہ کہ اس کو مشتبہ اور ساقط الاعتبار قرار دیا جائے۔ ہاں اگر اس کا کوئی جزو تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے سے کھوٹا ثابت ہو جائے تو اتنے حصہ کو بلاشبہ رد کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی بنا پر پورے مجموعہ کو مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی عقل کسی چیز کے رد و قبول کے معاملہ میں جو روش اختیار کرتی ہے وہ یہی ہے۔ انسان جب فطرت کی اس معروف شاہراہ سے ہٹتا ہے تو اس کا یہ ہٹنا یا تو اس کے وہمی پن کا نتیجہ ہوتا ہے، یا ہٹ دھرمی کا یا نفس پرستی کا یا بیک وقت ان تینوں ہی کا۔ اس طرح کے لوگوں کے نزدیک ہر وہ چیز قابلِ قبول ہوگی جو ان کی خواہشوں کے مطابق ہو اگرچہ اس کے حق میں کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی موجود نہ ہو۔ اور ہر وہ چیز باطل ہوگی جو ان کی خواہشوں کے خلاف ہو اگرچہ اس کا حق ہونا سورج کی طرح روشن اور بدیہی

اسی طرح یہ بھی ایک شدید غلط فہمی ہے جس میں بعض لوگ مبتلا ہیں کہ سنت کے معلوم کرنے کا واحد ذریعہ بس حدیث کی کتابیں ہی ہیں۔ ان کے خیال میں اگر حدیث کی کتابوں کے ناقابلِ اعتبار ہونے کا خیال لوگوں میں پیدا کر دیا جائے تو گویا سنت کی بنیادیں ڈھے گئیں۔ یہ خیال بھی محض ایک بے بنیاد خیال ہے۔

سنت کے معلوم کرنے کے متعدد ذریعے ہیں۔ اس کا سب سے زیادہ معتبر اور قابلِ یقین و اعتماد ذریعہ امت کا تواترِ عملی ہے۔ سنت کا اصل پہلو درحقیقت اس کا عملی پہلو ہی ہے۔ دین کا علمی پہلو تو قرآن میں بیان ہوا ہے۔ البتہ اس کا عملی پہلو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے نمایاں کیا۔ اپنی انفرادی زندگی میں بھی اور اپنی اجتماعی زندگی میں بھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو اپنایا اور انھوں نے بھی اس کا عملاً مظاہرہ کیا۔ جو باتیں شخصی زندگیوں سے تعلق رکھتی تھیں وہ ان کی روزمرہ زندگی میں نمایاں ہوئیں، جو باتیں حیاتِ اجتماعی و سیاسی سے تعلق رکھتی تھیں وہ ان کے نظامِ سیاسی و اجتماعی کا جزو بن گئیں۔ اگر کسی معاملہ میں اختلاف واقع ہوا کہ سنت کیا ہے تو وہ بھی زیرِ بحث آئی اور اس میں بھی کسی ایک پہلو کو یا تو ترجیح حاصل ہوئی یا اس معاملہ میں اختلافِ رائے کے باقی رہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا۔ ان ساری چیزوں کو سلف نے خلف کے لیے اپنے عمل سے بھی منتقل کیا اور اپنے قول سے بھی منتقل کیا۔ پھر تاریخ اور سیرت کی کتابوں نے بھی اس کی شہادت دی۔ اور ہمارے علماء اور فقہاء نے بھی ان ساری چیزوں کو ہر دور میں تازہ رکھا۔ جس چیز کو اتنے مختلف ذرائع ہماری طرف منتقل کرتے ہیں اس کو صرف ایک ذریعہ پر منحصر سمجھ لینا محض نادانی اور بے خبری کا نتیجہ ہے۔

بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ سنت کو ضبطِ تحریر میں لانے کا دورِ نبوی میں وہ اہتمام کیوں نہیں کیا گیا جو قرآن کے لیے کیا گیا؟ ہمارے نزدیک اس کی وجہ، جیسا کہ بعض نادانوں نے سمجھی ہے، سنت یا حدیث سے بے پروائی نہیں ہے بلکہ اس کی اصل وجہ سنت کا ایک عملی چیز ہونا ہے۔ قرآن کا غالب پہلو علمی اور ایمانی ہے اس لیے ضروری ہوا کہ اس کا ایک ایک حرف قیدِ تحریر میں آجائے۔ لیکن سنت ایک ایسی چیز تھی جس کو ہر مسلمان کے عمل میں نمایاں ہونا تھا۔ جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف بتانے کے لیے نہیں تشریف لائے تھے بلکہ اس کو کرکے دکھانے کے لیے آئے تھے۔ بلکہ اس سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کو دوسروں سے بھی کرانے کے لیے تشریف لائے تھے۔ حضورؐ کو اس راستہ پر خود بھی چلنا تھا اور دوسرے ہزاروں لاکھوں انسانوں کو بھی اس پر چلانا تھا۔ اگر سنت علمی اور نظری حقائق ہی پر مشتمل ہوتی تب تو اس کو محفوظ کرنے کا واحد طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ اس کو بلا کسی تاخیر کے ضبطِ تحریر میں لایا جاتا، لیکن جس چیز کی ایک ایک امتی کو مشق کرنی تھی اور جس کو پورے ملک کے لیے ضابطۂ اخلاق اور نظامِ زندگی بننا تھا اس کی حفاظت کے لیے اولین چیز یہی تھی کہ وہ لوگوں کی عملی زندگی میں منتقل ہو۔ اس کا تحریر میں آنا ایک امرِ ثانوی تھا۔ چنانچہ جب امت نے اس کی ضرورت محسوس کی یہ کام بھی انجام پا گیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ سنت کو سلف سے خلف کی طرف منتقل کرنے کا ایک اور ذریعہ بھی فراہم ہو گیا۔ یہ بات

سب متفق ہیں کہ یہ سنت کے معلوم کرنے کا قابل اعتماد ذریعہ ہیں لیکن اخبار آحاد کے معاملہ میں فقہ حنفی اور فقہ مالکی کے پیرو فقہ شافعی کے پیرووں سے مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ فقہ حنفی کے پیرو اُن معاملات میں اخبار احاد کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں جن کا تعلق عام لوگوں کی زندگی سے ہو۔ اس کی وجہ احادیث پر بے اعتباری نہیں ہے بلکہ سنت کے معاملہ میں ان کی احتیاط ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر کسی معاملہ کا تعلق عام ضرورت سے ہے تو اس کے بارہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مختلف طریقوں سے نقل ہونی چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہوا ہے بلکہ ایک ہی ذریعہ سے نقل ہوئی ہے تو ہوسکتا ہے کہ راوی سے کوئی بھول چوک ہوگئی ہو۔ اپنے اسی نظریہ کی بنا پر بعض اوقات وہ کسی مضبوط بنیاد پر قیاس کو اس طرح کی حدیث پر ترجیح دے دیتے ہیں۔ علی ہذا القیاس امام مالکؒ اگر کسی معاملہ میں خبر واحد کو اہل مدینہ کے عمل کے خلاف پاتے ہیں تو اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مدینہ صحابہ کا مرکز تھا، ان کا کسی عمل پر اتفاق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بتانے کے لیے کسی راوی کی روایت کے مقابل میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے مقابل میں شافعیہ خبر آحاد کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر کسی معاملہ میں قول رسول موجود ہے تو اس کی روایت میں ضعف کے بعض امکانات تسلیم کرنے کے باوجود وہ دوسروں کے قیاس اور عمل پر بہرحال ترجیح پانے کا مستحق ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں مسلک سنت رسول کے احترام و اہتمام کے نقطۂ نظر سے بالکل مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی اسپرٹ یہی ہے کہ سنت رسول اختیار کی جائے اور پوری احتیاط کے ساتھ اختیار کی جائے۔ اسی احتیاط ہی نے یہ تین الگ الگ مسلک پیدا کر دیے۔ ہم بجائے اس کے کہ اس اختلاف کو سنت یا حدیث کی بے اعتباری کی ایک دلیل بنائیں ہمیں ان تینوں مسلکوں کی روح دیکھنی چاہیے اور جس دیانت اور جس احترام سنت کو ان مسلکوں کے بانیوں نے مدنظر رکھا ہے اگر اسی دیانت اور اسی احترام سنت کو ہم پیش نظر رکھ کر ان میں سے کسی مسلک کو اختیار کریں گے تو ان شاء اللہ وہی سنت کا راستہ ہوگا اور اس کے اختیار کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضا ہوگی۔

اسی ذیل میں یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ جو احادیث احکام، قوانین یا بالفاظ دیگر سنت سے تعلق رکھنے والی ہیں محدثین نے دوسری نوعیت کی احادیث کے مقابل میں ان کی چھان بین زیادہ کی ہے اور فقہا کا تو کہنا کہ موضوع بحث ہمیشہ احکامی احادیث ہی رہی ہیں اس وجہ سے انھوں نے عقل و نقل اور روایت و درایت کی ہر کسوٹی پر ان کو اچھی طرح جانچا پرکھا ہے۔ اب فرض کیجیے کہ حدیث کی کتابوں میں ایک آدھ (باقی صفحہ ۲۸ پر)

سفر حج

امین احسن اصلاحی

پھر مکہ معظمہ میں

دوسرا عمرہ

مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد ہم سب سے پہلے عمرہ سے فارغ ہوئے۔ یہ عمرہ ہمارا دوسرا عمرہ تھا۔ اس مرتبہ میں نے اپنی والدہ مرحومہ کی طرف سے عمرہ کی نیت کی تھی اور میری اہلیہ نے اپنے والد مرحوم کی طرف سے۔ میں نفل عمرہ اور حج میں اسی طرح کی چند صورتوں میں کسی دوسرے کی طرف سے حج یا عمرہ کا قائل ہوں۔

عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے حجامت بنوانی چاہی تو ایک دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ میں اوپر کہیں اشارہ کر چکا ہوں کہ مناسک حج و عمرہ کے سلسلہ کی حجامت سے متعلق میرا ارادہ یہ تھا کہ پہلے عمرہ کے موقع پر قینچی سے سر کے بال ترشوا دوں گا، دوسرے عمرہ کے موقع پر مشین سر پر پھروا دوں گا، اور حج کے موقع پر پورا سر گھٹوا دوں گا۔ یہ نقشہ میں نے اس خیال سے بنایا تھا کہ مجھے حلق اور تقصیر دونوں کا ثواب حاصل ہوسکے۔ اس نقشہ کے مطابق قینچی کا مرحلہ تو گزر چکا تھا۔ اب باری مشین کی تھی۔ چونکہ یہاں حجامت بنانے والے زیادہ تر اناڑی ہوتے ہیں اس وجہ سے مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی اناڑی حجام غلط قسم کی مشین سے میرے سارے بال اکھاڑ کے نہ رکھ دے۔ میں نے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب سے کہا کہ اگر ہوسکے تو کوئی اپنا وطنی حجام بلوائیے، میں کسی اجنبی کی مشین کے نیچے اپنا سر دے دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ انھیں میری اس فرمائش کی تعمیل میں کچھ زیادہ زحمت پیش نہیں آئی۔ لائل پور کی سرزمین بڑی مردم خیز ہے۔ وہ فوراً ایک حجام کو بلا لائے اور کہا کہ یہ لائل پور کے رہنے والے ہیں اور تمھاری حجامت ٹھیک طرح سے بنا دیں گے۔ میں اس اطمینان سے بہت خوش ہوا اور مسعیٰ کے پیچھے ایک پتھر پر بیٹھ کر ان سے کہا کہ بسم اللہ۔ انھوں نے اپنا کام شروع کیا لیکن ابھی میرے آدھے ہی سر پر ان کی مشین پھری ہوگی کہ ایک پولیس کا آدمی دفعتہً نمودار ہوا اور ان کی کسبت اٹھا کر چلتا بنا۔ پولیس والا آگے آگے اور غریب حجام خوشامد اور لجاجت کرتا ہوا پیچھے پیچھے۔ اب

مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ میں حجامت کے لیے غلط جگہ پر بیٹھ گیا تھا اسی وجہ سے پولیس والا حجام کو تھانے لیے جارہا ہے۔ شیشہ میرے ہاتھ میں تھا، میں نے اس میں اپنی صورت جو دیکھی تو اس سوچ میں پڑگیا کہ حجام تو تھانے گیا، اب اس ہیئت کذائی کے ساتھ میں کہاں سر چھپانے کی کوشش کروں۔ اگرچہ صورت حال خاصی الجھن میں ڈال دینے والی پیدا ہوگئی تھی لیکن ایک پہلو میرے لیے خوشی کا بھی تھا کہ پولیس والا حجام ہی کو تھانے لے گیا۔ اگر اسی حالت میں وہ مجھے بھی تھانے لے جاتا تو کیسی مشکل پیش آجاتی!

لیکن میرا خیال ہے کہ یہاں کے پولیس والے بڑے کریم النفس ہوتے ہیں۔ حجام کی تھوڑی سی خوشامد سے وہ رام ہوگیا اور اس کی گسبت اس نے اس کے حوالہ کردی۔ یہاں کسی کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کا انداز بڑا پیارا ہوتا ہے۔ استمالت کے الفاظ بھی موثر ہوتے ہیں اور اس کا انداز بھی دلکش ہوتا ہے۔ بار بار ٹھوڑی یا داڑھی پر ہاتھ لے جاتے ہیں اور اللہ اور رسول کا حوالہ دیتے ہیں۔ ہاتھ جوڑنے یا پاؤں پر گرنے کی مذموم روش یہاں کے لوگ اختیار نہیں کرتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر درود بھی غصہ کو فرو کرنے کے لیے یہاں بڑی موثر چیز سمجھی جاتی ہے اور آدمی کے سینے میں ایمان ہو تو اس چیز کے موثر ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔

انفلوئنزا کا حملہ میں جس وقت عمرہ کے مناسک سے فارغ ہونے کے لیے سعی کر رہا تھا میں نے محسوس کیا کہ میں اب بیمار پڑنے والا ہوں۔ گھر لوٹ کر میں نے اس حالت میں کچھ شدت محسوس کی۔ میں نے اہلیہ سے اپنی حالت کا ذکر کیا تو انھوں نے بھی کہا کہ میں بھی نزلہ اور بخار کی کیفیت محسوس کر رہی ہوں۔ شام ہوتے ہوتے ہم دونوں اچھے خاصے بیمار ہی گئے۔ نزلہ، کھانسی، بخار اور درد سر نے اس زور سے ہم پر حملہ کیا کہ ہم صاحب فراش ہوگئے۔ اگرچہ اس بیماری کا یہ پہلو تو مبارک تھا کہ مدینہ منورہ کے بخار میں سے ہمیں بھی حصہ ملا لیکن اس خیال سے تھوڑی سی پریشانی بھی ہوئی کہ ہم جو اپنی کمزوریوں کے سبب سے اپنے ساتھیوں کے لیے پہلے بھی کچھ کم بوجھ نہ تھے اب اس بیماری کے سبب سے اور بھی بوجھ بن جائیں گے۔ اول اول تو حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے اپنی دواؤں کا ہمارے اوپر تجربہ کیا، لیکن پھر ڈاکٹر احمد علی صاحب کو، جن کا ذکر میں اوپر کہیں کرچکا ہوں، ہماری واپسی اور بیماری کا پتہ چل گیا۔ وہ سنتے ہی بھاگے ہوئے تشریف لائے۔ انھوں نے نہایت ہی اخلاص اور بڑی ہی بے تکلفی کے ساتھ شکوہ کیا کہ واپسی اور بیماری کی اطلاع مجھے کیوں نہیں دی گئی۔ انھوں نے فوراً انجکشن بھی لگائے اور کھانے اور پینے کے لیے مختلف دوائیں بھی تجویز کیں۔ اگرچہ سرکاری ملازم ہونے کے سبب سے زمانہ حج میں ان کو بڑی مصروفیت تھی لیکن وہ اپنی مصروفیت کے باوجود روزانہ دو ایک بار ہمیں دیکھنے ضرور آتے۔ ان کی دواؤں اور ان کے انجکشنوں سے

ہمیں بڑا فائدہ ہوا۔ بعض قیمتی دوائیں جو مکہ معظمہ میں مشکل سے دستیاب ہوتی تھیں، انھوں نے خاص اپنے اہتمام سے بلکہ اپنے جیب سے ہمارے لیے فراہم کیں۔

ڈاکٹر صاحب کے علاج سے بیماری کا اصلی زور تو ٹوٹ گیا لیکن ہم کمزور خاصے ہوگئے۔ اس کمزوری کے سبب سے ہم حرم کی حاضری سے محروم ہوگئے۔ سب سے زیادہ تشویش کا پہلو یہ تھا کہ ایام حج بالکل قریب آگئے تھے اور ہماری کمزوری کا یہ حال تھا کہ مکان کی چوتھی منزل سے اترنا اور اس پر چڑھنا ہمارے لیے سخت دشوار تھا۔ منیٰ و عرفات کی حاضری کا مرحلہ ایک سخت مرحلہ ہوتا ہے۔ ایک عازم حج کو اس مرحلہ کی اتنی فکر ہوتی ہے کہ اس کا اندازہ وہ لوگ کسی طرح نہیں کرسکتے جو اس مرحلہ سے گذرے نہ ہوں۔ مجھے سب سے زیادہ پریشانی اسی آگے کے مرحلہ کی تھی۔ میں بار بار یہی دعا کرتا تھا کہ اس مرحلے کے فرائض سے عہدہ برا ہونے کے لیے ہمیں قوت اور ہمت نصیب ہو اور اگر اس سرزمین پاک میں ہمارے لیے موت مقدر ہے تو خدا یہ موت عرفات کے میدان میں نصیب کرے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ زمانہ حج کے قریب آتے آتے ہم اچھے ہوگئے۔ صرف کھانسی کی تکلیف باقی رہ گئی تھی جو کچھ عرصہ کے بعد ایک اور کرم فرما ڈاکٹر کے علاج سے، جن کا ذکر آگے اپنے مقام پر آئے گا، جاتی رہی۔

زمانہ حج کے قریب بلد امین کا حال اب ایام حج بالکل قریب تھے اس وجہ سے مکہ معظمہ کی حالت اب وہ نہیں باقی رہی تھی جو اس وقت تھی جب ہم مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ اب شہر کا نقشہ بھی کچھ اور تھا اور حرم کا حال بھی بالکل مختلف تھا۔ اب جدھر نگاہ اٹھتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے اور لمحہ بہ لمحہ یہ سیلاب بڑھتا ہی جاتا تھا۔ حرم کے قرب و جوار میں مجھے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آتی تھی جہاں آدمی کمر ٹکا سکتا ہو اور وہاں کوئی نہ کوئی صاحب اپنا بستر نہ جمائے ہوئے ہوں۔ باب ابراہیم کے سامنے تعمیر حرم کے لیے پتھر ڈھیر تھے، ان پر بستر لگانے تو درکنار بیٹھ کر رات گذارنے کی بھی کوئی شکل میری سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن کتنے اللہ کے بندے انہی پتھروں پر راتیں گذارتے تھے۔

بیماری سے اٹھنے کے بعد نمازوں کے لیے جب میں حرم جانے لگا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اب حرم میں جگہ حاصل کرنا کارے دارد۔ پہلے تو میں نے نئے حرم میں قسمت آزمائی کی، لیکن جب اطمینان کی کوئی جگہ مجھے وہاں بھی نہ مل سکی تو میں نے مسعیٰ کی بالائی منزل پر جانا شروع کردیا۔ نمازوں کے اوقات میں حرم کے اردگرد کی سڑکیں اور گلیاں تک نمازیوں سے رک جاتی ہیں بلکہ حرم کے پاس کے مکانوں کے بے شمار آدمی

اپنے مکانوں کے چھجوں ہی پر صفیں بنا لیتے ہیں اور امام حرم کی اقتدا میں نماز ادا کرتے ہیں ۔

طواف کا تو میرے جیسے شخص کے لیے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ گیا ہے۔ بس ایک آدھ طواف کا موقع اگر میسر آجاتا تو ہم اسی کو غنیمت سمجھتے ۔ نجد کے بدوی قبائل کے جو لوگ جمع ہو گئے تھے ان کے طواف کا طریقہ بھی ایسا تھا کہ میری تو ان کو دیکھ کر روح پرواز کرتی تھی ۔ ان لوگوں کے طواف کا طریقہ یہ تھا کہ ہر ٹولی کا ایک مرد جانباز آگے ہو جاتا اور ٹولی کے بقیہ تمام چھوٹے بڑے افراد عورتوں اور بچوں سمیت اس کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ لیتے ، پھر وہ سب کو کہنیوں سے چیرتا پھاڑتا اور دھکے دیتا ہوا آگے بڑھتا اور اس کے سارے ساتھی ہر ایک سے لڑتے بھڑتے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ۔ ان لوگوں کے آجانے کے بعد سے میری طواف کی ہمت بہت کمزور پڑ گئی ۔ سخت سے سخت ازدحام کے اوقات میں بھی میں نے اس بات کی کوشش کی کہ نہ کسی کو دھکا دوں اور نہ کسی کا دھکا کھاؤں لیکن ان جانبازوں کے مقابل میں میری ساری احتیاطیں ناکام ہو کے رہ گئیں ۔ ان کے دھکے سب کو کھانے پڑتے ہیں ۔

آدمیوں کی اس کثرت نے شہر اور حرم کی صفائی کے سارے نظم کو بھی درہم برہم کر کے رکھ دیا ۔ حجاز میں مہتروں کا وجود نہ ہونے کے باوجود شہروں میں صفائی کا انتظام کچھ ایسا خراب نہیں ہے ۔ بالخصوص حرم کے خدام تو حرم میں صفائی کا خاص اہتمام رکھتے ہیں لیکن حج کے زمانہ میں حالات بالکل قابو سے باہر ہو جاتے ہیں ۔ شہر اور اس کی گلیاں تو الگ رہیں حرم اور اس کے گرد و پیش کو بھی لوگ بالکل گندا کر کے رکھ دیتے ہیں ۔ بالخصوص یمن اور حبشہ کے لوگ اس گندگی کے پھیلانے میں بہت بے پروا ہیں ۔ باب ابراہیم کے پاس کنکریوں کا ایک پلاٹ خواتین کے لیے مخصوص تھا ۔ میں اکثر دیکھتا تھا کہ اس پلاٹ میں بچے پاخانہ پھر دیتے تھے اور حبش اور یمن کی خواتین بس یہ کرتی تھیں کہ اس گندگی کو کنکریوں سے ڈھانک دیتی تھیں ۔ ایک ستم یہ ہے کہ حاجی حضرات حرم کے کبوتروں کے لیے گندم خرید خرید کر کنکریوں والے پلاٹوں میں بکھیرتے رہتے ہیں ۔ حج کے زمانہ میں اس کی مقدار اتنی ہو جاتی ہے کہ بلا مبالغہ کنکریوں کے اوپر گندم کی ایک تہہ بچھ جاتی ہے ۔ پھر جب اس پر لوگ بے احتیاطی سے پانی گراتے ہیں اور وہ گندم سڑتی ہے تو اس سے تعفن پیدا ہوتا ہے ۔ اس کا بہت آسان علاج یہ تھا کہ حرم سے باہر ایک خاص پلاٹ کبوتروں کو دانے ڈالنے کے لیے بنوا دیا جاتا اور حرم کے اندر ان کے لیے دانے ڈالنے کی ممانعت کر دی جاتی ۔

جگہ جگہ حرم میں میں نے لوگوں کو بے احتیاطی کے ساتھ تھوکتے اور ناک صاف کرتے بھی دیکھا ۔ اس معاملے

میں لوگ مجبور بھی ہوتے ہیں ۔ آخر ہجوم کے اوقات میں کسی کو تھوکنے یا ناک صاف کرنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ کیا کرے ۔ اس ضرورت کے لیے اگر جگہ جگہ ستونوں کے ساتھ ٹین یا لکڑی کے ڈبے بندھوا دیئے جائیں اور ان کو وقتاً فوقتاً چونے یا ریت سے بھروایا جاتا رہے اور ان کی صفائی ہوتی رہے تو اس سے بہت بڑی حد تک صورت حال کی اصلاح ہو سکتی ہے ۔

اس ظاہری گندگی سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ نمایاں ہوئی کہ بہت سے ممالک کے حجاج شرم و حیا کے حدود محفوظ رکھنے کے معاملہ میں بالکل بے شعور نظر آئے ۔ باب ابراہیم کے پاس توسیع حرم کی اسکیم کے تحت جو نیو کھودی گئی تھی حبشہ اور یمن کے حجاج نے اس کو رفع حاجت کا مرکز بنا رکھا تھا ۔ اور یہ کام وہ جس بے تکلفی کے ساتھ انجام دیتے تھے اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ حیا جس چیز کا نام ہے اس کے مفہوم سے یہ حضرات بالکل ناآشنا ہیں ۔ زمزم کے پاس اب حکومت نے پانی پینے کی آسانی بہم پہنچانے کے لیے ٹونٹیاں لگوا دی ہیں لیکن بعض لوگوں کو میں نے ان سے جو فائدہ اٹھاتے دیکھا وہ یہ ہے کہ ان کے نیچے وہ ننگے ہو کر نہاتے تھے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ سفر بہت سی باتوں کے لیے انسان کو مجبور کر دیتا ہے لیکن ان خرابیوں کی اصلی وجہ مجبوری نہیں بلکہ یہ ہے کہ تمام مسلم ممالک کی یہ مشترک خرابی ہے کہ عوام کے ذمہ داروں نے عوام کو مہذب اور شائستہ بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے ۔

خرید و فروخت کی گرم بازاری حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ میں خرید و فروخت کی جو گرم بازاری ہوتی ہے اس کا اندازہ ہم آپ کسی طرح نہیں کر سکتے ۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ اس زمانہ میں اہل مکہ حاجیوں کے ہاتھوں اس مقدس سرزمین کی مٹی اور اس کا پانی تک بیچ لیتے ہیں ۔ کھانے پینے کی چیزیں یہاں بہت مہنگی ہیں لیکن چھنگے سے لے کر اونٹ تک جو چیز بھی بازار میں پہنچ جاتی ہے بے تکلف بکتی ہے ۔ کچے پکے پھل لوگ کھیتوں اور باغوں سے توڑ کر بازاروں میں لا ڈالتے ہیں اور ہر چیز فروخت ہو جاتی ہے ۔

سب سے زیادہ کثرت کے ساتھ تمدنی چیزیں فروخت ہوتی ہیں ۔ سعودی حکومت میں اشیائے درآمد پر کسٹم نہیں ہے اس وجہ سے ولایت کے بازاروں کی چیزیں یہاں بہت سستی بکتی ہیں ۔ ریشمی کپڑے ، قالین ، غالیچے ، جانمازیں ، رومال ، گھڑیاں ، تھرماس ، چولھے اور اس قسم کی دوسری چیزیں ہمارے بازاروں کے لحاظ سے اتنی ارزاں بکتی ہیں کہ جو آدمی بازار کی طرف نکل جائے اس کا ایمان آزمائش میں پڑ جاتا ہے ۔ حاجی صاحبان دل کھول کر خرید و فروخت کرتے ہیں ۔ بہت سے لوگوں کے رویہ سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ سفر کرتے ہی اس خرید و فروخت کے لیے ہیں ۔

ہماری حکومت نے اگرچہ زرمبادلہ پر بہت سی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں لیکن میں نے دیکھا کہ طلب صادق رکھنے والے زرمبادلہ کی بھی ہزاروں راہیں کھول لیتے ہیں۔ یہ چیزیں جس دھوم دھام سے بکتی ہیں وہ منظر بھی دیدنی ہوتا ہے۔ مجھے بازار کی طرف جانے کے مواقع تو کم ہی پیش آئے لیکن بعض گلیوں اور سڑکوں سے ایک آدھ مرتبہ گذرنا ہوا، تو میں نے دیکھا کہ لوگ تھرماس اور گھڑیاں اس طرح خرید رہے ہیں جس طرح مچھلی کے بازار میں مچھلی کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ دکان دار یہ سوچتے ہیں کہ اگر سیزن نکل گیا تو پھر سال بھر مال کا پوچھنے والا کوئی نہیں ملے گا اور خریداروں کا انداز یہ ہوتا ہے کہ آج چوک گئے تو معلوم نہیں پھر یہ چیز ہاتھ آئے یا نہ آئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دکان داروں اور گاہکوں دونوں کا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ اس سے بہت کچھ مختلف ہوتا ہے جس کی مثالیں ہمارے ہاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں کے دکان دار گاہکوں پر اعتماد ہمارے دکان داروں کی نسبت سے زیادہ کرتے ہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا کہ وہ چیزیں بار بار دکانوں سے لاتے ہیں اور ناپسند ہونے کی صورت میں ان کو بدلوا لیتے ہیں۔

میرے لیے اس خرید و فروخت کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ تھا کہ یہ تمدنی چیزیں بڑی کثرت کے ساتھ ان لوگوں نے بھی خریدیں جن میں سے اکثر کو اس طرح کی چیزوں کے استعمال کا کوئی تجربہ پہلے سے نہ تھا۔ مجھے اس کا اندازہ اس طرح ہوا کہ واپسی میں جہاز میں ایک صاحب کبھی کبھی اپنی گھڑی میں کنجی دینے اور اس کے وقت کو ٹھیک کر دینے کی خواہش مجھ سے کیا کرتے۔ وہ گھڑی کلائی میں باندھتے بھی الٹی تھے لیکن میں نے ان کو ٹوکنے کی ہمت نہیں کی۔ میں نے خیال کیا کہ فیشن کی تلون پسندیوں کا کیا اعتبار، ممکن ہے اب یہی فیشن ہو۔ آخر میں فیشن کا کوئی ماہر تو نہیں ہوں۔ ان کی گھڑی خاصی قیمتی معلوم ہوتی اس وجہ سے یہ تعجب ضرور ہوتا کہ آخر اس بے خبری کے باوجود انھوں نے اتنے روپے اس گھڑی پر کیوں خرچ کر ڈالے۔ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے کسی دوست یا عزیز کی فرمائش ہو یا پاکستان پہنچ کر بیچ دینے کا ارادہ ہو۔

حجاج کے شب و روز عام حجاج کے شب و روز اژدہام کے زمانے میں خاصے سخت گذرتے ہیں۔ مکانوں کی قلت اور کرایوں کی غیر معمولی زیادتی کے سبب سے معقول قسم کی رہائش کا انتظام بہت تھوڑے لوگ کر پاتے ہیں۔ اندرون ملک کے جو زائرین آتے ہیں وہ تو بالعموم سڑکوں کے کناروں ہی پر اپنے خیمے لگا لیتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنے ٹرک ساتھ لاتے ہیں، وہ اپنے قافلے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ ان ٹرکوں کے سایہ ہی میں دن گذارتے ہیں۔ جو لوگ کوئی مکان کرایہ پر لیتے ہیں عموماً اس کا فائدہ انھیں اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہوتا کہ ایک مکان کے ساتھ ان کو نسبت حاصل ہو جاتی ہے، مکان کی کوئی راحت ان کو مشکل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی فائدہ

اس مکان سے وہ حاصل کر پاتے ہیں تو بس یہ کہ اس میں کسی نہ کسی طرح اپنے سامان انبار کر دیتے ہیں۔ کرایہ کی کفایت کے خیال سے ایک ایک کمرہ میں اتنے آدمی شریک ہو جاتے ہیں کہ وہ کمرہ ایک انار صد بیمار کا مصداق بن کے رہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالعموم یہ لوگ مکان رکھتے ہوئے بھی لامکاں ہی رہتے ہیں۔ رفع حاجت کہیں کر لیتے ہیں، نہانے پر مجبور ہوئے تو نگرانوں کی آنکھیں بچا کر زمزم کی ٹونٹیوں کے نیچے کھڑے ہو گئے، نیند کا غلبہ ہوا تو حرم کی کنکروں پر پڑ رہے۔ ہمارے مکان کے پیچھے ایک مکان میں مصری اور شامی حجاج ٹھہرے ہوئے تھے۔ بلا مبالغہ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں کوئی پندرہ بیس افراد رہے ہوں گے۔ جب کبھی اتفاق سے یہ سب شرکا جمع ہو جاتے تو ان کے بیٹھنے کے لیے بھی جگہ اتنی تنگ ہوتی کہ سب دوزانو ہو کر ہی بیٹھتے۔ لیکن یہ لوگ تھے بڑے بھلے مانس، میں نے ان کو لڑتے جھگڑتے بہت کم دیکھا۔ اس طرح کے حالات کے اندر سب سے زیادہ تکلیف خواتین کو ہوتی ہے۔ مصر اور شام وغیرہ کی خواتین تو کسی نہ کسی طرح گذار لے جاتی ہیں، ان کی روایات ہماری روایات سے مختلف ہیں، لیکن ہمارے ملک کی خواتین کے مزاجوں پر اس صورت حال کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔

مکہ کی گرمی میں آدمی دو ایک مرتبہ روزانہ نہ نہائے تو ہلکان ہونے لگتا ہے لیکن زمانہ حج کے قریب اور ایام حج میں سقے پانی کا بھاؤ اس قدر چڑھا دیتے ہیں کہ عام لوگ نہانے کی ہمت مشکل ہی سے کر سکتے ہیں۔ کھانے کی چیزیں سارے حجاز میں عام حالات میں بھی بہت گراں ملتی ہیں لیکن ایام حج کے قریب تو بس کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ کوئی شخص تھوڑا سا خشکہ اور تھوڑی سی دال بھی خریدے تو اس کی قیمت بھی ڈیڑھ دو ریال بن جائے گی اور لطف یہ کہ چاول اور دال دونوں میں اچھا خاصا اوسط کنکروں کا بھی ہوگا۔ ہم جس زمانے میں تھے وہ زمانہ پھلوں کا نہیں تھا اس وجہ سے پھل خراب بھی ملتے تھے اور خاصے گراں بھی۔ البتہ کیلے نسبتہً سستے اور نہایت اچھے ملتے تھے۔ ہم لاہور سے کیلوں کے لیے ترسے ہوئے گئے تھے اس وجہ سے کیلے خوب کھاتے تھے۔

ہجوم سے اُنس میرے اندر ابتدا سے یہ بڑی کمزوری رہی ہے کہ جہاں ذرا کوئی ہجوم نظر آیا اور مجھ پر گھبراہٹ اور الجھن کی حالت طاری ہوئی۔ لیکن حجاج کے اس سمندر میں رہتے رہتے میں اس سمندر کی ایک مخلوق بن گیا۔ میں مسعیٰ سے لے کر اپنی قیام گاہ تک شب و روز میں کتنی مرتبہ آتا جاتا اور محسوس ایسا ہوتا کہ انسانوں کی ایک موج کے کندھے پر سوار ہو کر جاتا ہوں اور ایک موج ہی کے کندھوں پر سوار ہو کر واپس لوٹتا ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ اس ہجوم میں افراتفری اور دھکم پیل کی کیفیت زیادہ نہیں ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے شخصی ارادہ سے دستبردار ہو کر اپنے آپ کو بس ہجوم کے حوالہ کر دیتا ہے۔ دن کے وقتوں میں اگر کوئی ڈر ہوتا ہے تو یہ ہوتا ہے کہ کسی کی چھتری کی تیلیاں آپ کی آنکھوں

میں نہ گھس جائیں۔ اس خطرے کی مدافعت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ بھی اپنے پاس چھتری رکھیے۔ میں بھی اپنے پاس چھتری رکھتا تھا اور دھوپ کے بچاؤ سے زیادہ میرے پیش نظر یہی چیز ہوتی کہ میری آنکھیں دوسروں کی بے شمار چھتریوں سے محفوظ رہیں۔ اس زمانہ میں اگر کوئی شخص مطاف میں اترے تو اس کے لیے بھی بہترین حکمت عمل یہی ہے کہ اپنے آپ کو بس موجوں کے حوالہ کر دے۔ صرف اتنی بات کا خیال رہے کہ ان نجدی جانبازوں کی زد میں کہیں نہ آجائے جن کا ذکر میں کہیں اوپر کر چکا ہوں۔

ہجوم کے ساتھ سازگاری کی حقیقت سمجھانے کے لیے میں ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر کرتا ہوں۔ میں نے وہاں حرم آنے جانے کے لیے ربڑ کی چپلیں خریدی تھیں۔ یہ چپلیں نہایت آرام دہ تھیں۔ میں ایک روز نماز پڑھ کے باب الجیاد سے نکلا اور گھر کی طرف چلا تو ہجوم میں کسی کے پاؤں میں پھنس کر میرے ایک پاؤں کی چپل وہیں رہ گئی۔ چپل اگرچہ نئی تھی، اس کے یوں ضائع ہو جانے کا مجھے تھوڑا سا افسوس ہوا، لیکن میں نے اس کی طرف مڑ کے دیکھنے کی زحمت بھی نہیں اٹھائی۔ اگر کیا تو یہ کیا کہ دوسرے پاؤں کی چپل بھی وہیں چھوڑ دی۔ اگر خدانخواستہ میں اس چکر میں پھنس جاتا کہ گم شدہ چپل کو حاصل کروں تو یہ چیز مجھے مہنگی پڑ جاتی۔ البتہ یہ میرا محض ایک تکلف تھا کہ میں نے دوسری چپل بھی وہیں چھوڑ دی۔ اگر میں اسی حالت میں گھر لوٹتا کہ میرے ایک پاؤں میں چپل ہوتی اور دوسرا پاؤں ننگا ہوتا جب بھی کوئی شخص یہاں میری اس حالت پر ہنسنے والا نہیں تھا۔ یہاں آدمی ہر وقت اتنی قسم کی شکلیں، اتنی قسم کی وضعیں اور اتنے گوناگوں اور بوقلموں نقش دیکھتا رہتا ہے کہ اس کے لیے کوئی نقش بھی عجیب نہیں رہ جاتا۔ یہ عین ممکن تھا کہ کوئی شخص میرے ایک پاؤں میں چپل دیکھ کر اس پر ہنسنے کے بجائے اس سے یہ نتیجہ نکال لیتا کہ شاید میں کسی ایسے ملک سے تعلق رکھتا ہوں جہاں کے لوگ ایک ہی پاؤں میں جوتی پہنتے ہیں۔

عرفات کی فکر

عرفات کی فکر بھی ایک بڑی ہی جان گسل فکر ہے۔ میں دوسروں کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن میرے لیے تو اس فکر نے ایک بیماری کی سی شکل اختیار کر لی۔ رات کو سوتا تو آخری چیز جو میرے ذہن پر سے اترتی وہ یہی فکر ہوتی اور صبح کو اٹھتا تو پہلی چیز جو میرے ذہن کے اندر داخل ہوتی وہ یہی فکر ہوتی۔ بس ہر وقت یہی خیال کہ پروردگار نے یہاں تک پہنچایا ہے تو خیریت اور سلامتی کے ساتھ عرفات میں بھی پہنچا دے۔ کئی دن پہلے سے میں نے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کو تاکید کرنی شروع کی کہ معلم صاحب سے عرفات جانے کے انتظامات کی تفصیلات معلوم کریں۔ وہ جو تفصیلات سناتے اس سے یہ معلوم ہوتا کہ معلم صاحب سارے انتظامات سے فارغ ہیں۔ ایک معلم صاحب کا جو تجربہ ہوا تھا وہ بھی ہر پہلو سے اطمینان بخش تھا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ ہر حاجی کو عرفات پہنچانا صرف

معلم حضرات کی ذمہ داری ہی نہیں ہے بلکہ خود حکومت کی بھی ذمہ داری ہے اور سعودی حکومت اپنی اس ذمہ داری کے ادا کرنے میں نہایت فرض شناس اور مستعد ہے لیکن ان ساری معلومات کے بعد بھی میرے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہوتے رہتے اور وہ مجھے ستاتے رہتے۔

آنے والوں کا انتظار

اس دوران میں ہمیں ہندوستان اور پاکستان سے آنے والے بعض دوستوں کا انتظار بھی رہا۔ ہندوستان سے جو آنے والے تھے وہ آخری جہاز سے آ گئے۔ ان میں میرے لیے قابل ذکر میرے ایک عزیز مولوی قمر الزماں صاحب اصلاحی تھے۔ یہ میرے عزیز بھی ہیں اور میرے شاگرد بھی۔ ان کو بچپنے سے مجھ سے انس رہا ہے اور میرے دل کو بھی ان سے خاصا تعلق ہے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اور ان کو بڑی اچھی جگہ یکجا کر دیا۔ یہ آنے تو میرے لیے بمبئی سے ایک دوست کا بھیجا ہوا آموں کا تحفہ بھی لائے۔ اگرچہ بمبئی سے مکہ معظمہ تک پہنچتے پہنچتے ان آموں کی مقدار تو بہت تھوڑی رہ گئی تھی لیکن بھیجنے والے اور لانے والے کے خلوص کی مقدار بہت زیادہ تھی اور کسی تحفے کی اصلی روح یہ خلوص ہی ہے۔

پاکستان سے پہنچنے والے آخری جہاز کو عجیب اتفاق پیش آیا۔ حجاج کے مکہ سے منیٰ کے لیے روانہ ہونے میں صرف دو دن باقی رہ گئے لیکن یہ جہاز جدہ نہیں پہنچا۔ یہ جہاز اپنی پہلی ٹرپ میں بھی راستہ میں گڑبڑ ہو گیا تھا اس وجہ سے ہر شخص کو نہایت بے چینی کے ساتھ اس کا انتظار تھا۔ میں نے حکیم صاحب سے کہا کہ پاکستانی سفارت خانہ یا اپنے معلم کے وکیل مقیم جدہ سے رابطہ قائم کر کے معلوم کریں کہ جہاز اب تک کیوں نہیں پہنچا۔ حکیم صاحب نے معلومات حاصل کر کے شام کو یہ اطلاع دی کہ جہاز کا انجن خراب ہو چکا ہے اور وہ جدہ سے کچھ دور سمندر میں کھڑا ہے۔ اس خبر سے دل کو جو صدمہ پہنچا میں اس کا اندازہ نہیں کرا سکتا۔ فرط غم سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب منیٰ اور عرفات کے لیے روانگی میں صرف دو راتیں حائل رہ گئی تھیں۔ مجھے جب یہ خیال آتا کہ ان عازمین حج پر اس وقت کیا گزر رہی ہوگی جو اس جہاز پر ہیں تو میرا دل صدمہ سے پھٹنے لگتا۔ میں نے نہایت پریشانی کے عالم میں حرم میں جا کر ان مسافروں کے لیے دعائیں کیں۔ بالآخر جب منیٰ کے لیے روانگی میں صرف بارہ گھنٹے باقی رہ گئے تو یہ مژدۂ جانفزا موصول ہوا کہ جہاز ساحل جدہ پر لنگر انداز ہو چکا ہے اور حکومت پوری مستعدی کے ساتھ حجاج کو مکہ معظمہ پہنچانے کا انتظام کر رہی ہے۔ میں یہ خبر سن کر سجدہ میں گر پڑا۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ عین اس وقت جب کہ ہم منیٰ کے لیے روانہ ہو رہے تھے یہ عازمین حج مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

بقیہ تذکرہ و تبصرہ

صاحب ترجمان نے میری تعریف غیبت کو غیر جامع و مانع ثابت کرنے کے لیے جو دو ایک مثالیں ذکر کی ہیں وہ مثالیں خود انہی کے الفاظ میں یہاں پیش کرتا ہوں تاکہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہو سکے، پھر ان کے متعلق اپنی ناچیز گذارش عرض کروں گا۔ صاحب ترجمان فرماتے ہیں:-

"مثال کے [illegible] ایک شخص [illegible] کے ہاں نکاح کا پیغام دیتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ ایک بدخو، بدکردار آدمی ہے۔ اب لوگ [illegible] بتا کر کہتے ہیں کہ یہ شخص ایسا اور ایسا ہے۔ آپ کی نیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس شخص کو برا آدمی جان کر اپنی دامادی کے قابل نہ سمجھے اور ساتھ ہی آپ لڑکی کے باپ سے بتاکید یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ دیکھنا، اس شخص کو خبر نہ ہو کہ میں نے اس کے حالات آپ کو بتائے ہیں۔ یہ چیز اگرچہ بربنائے ضرورت شریعت میں مباح کی گئی ہے لیکن یہ پوری طرح "غیبت محرمۃ فی الشرع" کی اس تعریف میں آجاتی ہے جو آپ نے نقل فرمائی ہے کیونکہ اس میں تحقیر کا ارادہ اور اخفا دونوں موجود ہیں۔"

صاحب ترجمان مذکورہ صورت کو غیبت کی ایک ایسی صورت قرار دیتے ہیں جو ہر شخص کے نزدیک جائز ہے کیونکہ ضرورت اور حکمت عملی اس کے جواز کی متقاضی ہے لیکن راقم سطور نے غیبت کے غیبت ہونے کے لیے چونکہ تحقیر کے ارادہ اور خواہش اخفا کی شرطیں لگا دی ہیں اس وجہ سے صاحب ترجمان کی مذکورہ غیبت میری تعریف کی رو سے حرام ہو جاتی ہے۔

جواب میں میری طرف سے یہ عرض ہے کہ مذکورہ صورت کا غیبت سے نہ قریب کا کوئی رشتہ ہے نہ دور کا۔ اس طرح کی صورتوں میں ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کو جو مشورہ دیتا ہے وہ بربنائے ضرورت و حکمت عملی غیبت کو مباح ٹھہرا کر نہیں دیتا ہے بلکہ اس طرح کے مشورے دینے کے لیے از روئے کتاب و سنت وہ مامور ہے۔ قرآن و حدیث میں مثبت طور پر ہر مسلمان کو یہ ہدایت ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ، اس کے رسول اور اپنے مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی کرتا رہے۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں:-

"تمیم بن اوس الداری سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دین دراصل خیر خواہی ہے۔ ہم نے پوچھا کس کی خیر خواہی؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی، مسلمانوں کے

حکمرانوں کی اور عام مسلمانوں کی" (مسلم)

"جریر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے پر بیعت کی۔" (مسلم)

"انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔" (متفق علیہ)

غور فرمائیے کہ جب اجمالی طور پر ہر مسلمان کے سامنے مذکورہ بالا ہدایات موجود ہیں اور یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ دین دراصل نام ہی اس خیر خواہی کا ہے اور اپنے بھائی کے لیے اس طرح کی خیر خواہی کے بغیر کوئی شخص سچا مومن نہیں ہو سکتا تو دین کی اتنی بڑی نیکی کے انجام دینے کے لیے اس کو غیبت کا ناپاک ڈھکنا اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ براہ راست دین کے ان بنیادی تقاضوں کے تحت یہ کیوں نہ سمجھے گا کہ اپنے بھائی کو اس کی اولاد کے باب میں صحیح مشورے دینا اس کے واجبات دینی میں سے ہے۔ اس طرح کے مشورے غیبت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اس لیے کہ ان کی بنیاد خیر خواہی ہے اور غیبت کی بنیاد بدخواہی۔ دونوں کی اصل و نسل بالکل مختلف ہے۔ اس طرح کی خیر خواہی کرنے والے کے لیے اس بات میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ جس کی خیر خواہی کرے اس کو رازداری کی تاکید بھی کر دے۔ اس تاکید سے اس کی خیر خواہی غیبت نہیں بن جائے گی بلکہ اس تاکید سے وہ دینی نیکی پر ایک مزید نیکی کا اضافہ کرے گا۔ اسلام میں جس طرح اجمالی طور پر یہ ہدایت ہے کہ وہ اپنے بھائی کو صحیح قسم کے خیر خواہانہ مشورے دے اسی طرح مشورہ کے باب میں یہ اصول قائم کر دیا گیا ہے کہ المستشار مؤتمن یعنی جس سے مشورہ کیا جائے وہ ایک امین اور محرم راز بن جاتا ہے۔ اس کے لیے ایک طرف تو یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے علم کے حد تک صحیح مشورے دے اور دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ نہ وہ کسی پر یہ ظاہر کرے کہ اس سے کیا مشورہ لیا گیا ہے اور نہ یہ بتائے کہ اس نے کیا مشورہ دیا ہے۔ اب غور کیجیے کہ جب مستشار پر یہ ذمہ داری شرع شریف نے ڈالی ہے تو مستشیر کے لیے یہ بات کیونکر جائز رکھی جا سکتی ہے کہ وہ لوگوں میں اشتہار دیتا پھرے کہ فلاں شخص نے مجھے فلاں معاملہ میں فلاں مشورہ دیا ہے۔ اسی وجہ سے اس طرح کے معاملات میں رازداری کی تاکید بجائے خود ایک نیک تلقین ہے۔ اس تلقین سے کسی کی خیر خواہی غیبت نہیں بن جائے گی بلکہ یہ اس کی طرف سے، جیسا کہ عرض کیا گیا، ایک مزید نیکی ہوگی۔

بہر حال میرے نزدیک مذکورہ صورت کو غیبت کی ایک ایسی صورت سمجھنا جس کو حکمت عملی کے تحت جائز کیا گیا ہے

دین میں تعمق کا کوئی ثبوت نہیں ہے، بلکہ بے ادبی معاف ہو تو میں اس کو "غیبت خولیا" کی ایک بیماری سے تعبیر کروں گا جس کے اثر سے مریض کا یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ دین کے سارے احکام و واجبات اور سارے فرائض و نوافل کے متعلق یہ خیال کرنے لگا ہے کہ یہ سب کے سب دین میں خود اپنی کوئی اصل و اساس نہیں رکھتے بلکہ حکمِ عمل کے تحت غیبت کے حرام دروازے کو توڑ کر جائز ٹھہرائے گئے ہیں۔ اگر یہ فی الواقع "غیبت خولیا" کی کوئی بیماری ہے تو اس کا علاج میرے پاس تو کیا سچی بات یہ ہے کہ جالینوس کے پاس بھی نہیں تھا۔

صاحب ترجمان میری تعریف غیبت پر جرح کے لیے دوسری فرضی مثال یہ پیش کرتے ہیں:

"دوسری طرف ایک ایسا شخص ہے جو محض لذت کلام اور لطیفہ گوئی کی خاطر اپنے یار دوستوں میں بیٹھ کر بعض لوگوں کے عیوب بیان کرتا ہے اس کی نیت ان کی تحقیر کی نہیں ہوتی (چاہے وہ لوگ حقیقت میں سننے والوں کی نگاہ سے گر ہی کیوں نہ جائیں) اور اسے اس بات کی بھی پروا نہیں ہوتی کہ ان لوگوں کو اس کی باتیں پہنچ جائیں۔ یہ چیز شریعت میں حرام ہے لیکن یہ غیبت حرام کی اُس تعریف سے خارج رہتی ہے کیونکہ اس میں نہ تحقیر کی نیت موجود ہے نہ اخفا کی خواہش و کوشش۔"

مذکورہ صورت میں مفروضات کا جو ہوائی قلعہ تعمیر کیا گیا ہے اگر میں اس کا علمی تجزیہ کروں تو ساری عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہے گی۔ لیکن میں یہاں بحث میں طریق الزامی اختیار کروں گا۔ یعنی میں بغیر کسی رد و قدح کے مانے لیتا ہوں کہ مذکورہ صورت میں نہ تحقیر[1] کی نیت موجود ہے اور نہ اخفا کی خواہش۔ اور جب یہ دونوں چیزیں موجود نہیں ہیں تو مجھے یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ مذکورہ صورت میری تعریف غیبت کی رو سے غیبت سے خارج ہو جاتی ہے۔ سو میں بے چون و چرا یہ تسلیم کیے لیتا ہوں کہ مذکورہ صورت غیبت کے حکم سے خارج ہے۔ لیکن اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ایسا شخص غیبت کے الزام سے تو بری ہو گا کیونکہ اس کے اس فعل میں غیبت کے شرائط پائے نہیں جاتے لیکن ھمز و لمز اور جہر بالسوء یعنی بدگوئی، عیب جوئی اور تمسخر کے الزام سے وہ بری نہیں ہو گا اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ شریعت میں صرف غیبت ہی حرام نہیں ہے بلکہ ھمز و لمز، جہر بالسوء بھی حرام ہے۔ دلائل ملاحظہ ہوں جس سورہ میں غیبت کی حرمت بیان ہوئی ہے اسی میں یہ آیت بھی وارد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ

اے ایمان والو، کوئی قوم کسی دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے بہت ممکن ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک ان سے بہتر ہوں

[1] تحقیر کی نیت تو موجود نہیں ہے غالباً تشریف و تکریم کی نیت ہو گی!

وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ (۱۱۔ حجرات)

اسی طرح عورتوں کی کوئی جماعت بھی عورتوں کی دوسری کسی جماعت کا مذاق نہ اڑائے بہت ممکن ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک ان سے بہتر ہوں۔ اور اپنے بھائیوں کو عیب نہ لگاؤ اور ایک دوسرے پر پھبتیاں نہ چست کرو۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ (ھمزہ ۱)

ہلاکی ہو ہر اشارہ بازی اور عیب گوئی کرنے والے کے لیے۔

دوسری جگہ ہے:

لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَن ظُلِمَ (۱۴۸۔ نساء)

اللہ تعالیٰ زبان سے برائی کے اظہار کو پسند نہیں کرتا ہے مگر اس کے لیے جو مظلوم ہو۔

اب صاحب ترجمان یہ ارشاد فرمائیں کہ انھیں مذکورہ صورت کے غیبت ہی کے تحت لانے پر کیوں اصرار ہے؟ آخر یہ کون سا طرز فکر ہے کہ بیرو ... کے جتنے کام بھی ہیں غیبت ہی سب کا سرچشمہ بن کے رہ گئی ہے؟

یہ دو مثالیں تو فرضی مثالیں تھیں۔ صاحب ترجمان نے ایک مثال واقعاتی بھی پیش کی ہے جس سے جناب موصوف کا خیال ہے کہ میری تعریف غیبت مجروح ہو جاتی ہے۔ پہلے صاحب ترجمان کا بیان خود ان کے الفاظ میں پڑھیے۔ اس کے بعد میں اپنا جواب عرض کروں گا۔ صاحب ترجمان فرماتے ہیں:-

"جس چیز کو خود شارع نے بصراحت غیبت حرام قرار دیا ہے وہ بھی اس تعریف کے حدود سے خارج ہو جاتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ماعز بن مالک اسلمی کو زنا کے جرم میں جب رجم کر دیا گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے راہ چلتے دو صاحبوں کو ایک دوسرے سے باتیں کرتے سنا۔ ان میں سے ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ اس شخص کو دیکھو، اللہ نے اس کا پردہ ڈھانک دیا تھا مگر اس کے نفس نے اس کا پیچھا اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک یہ کتے کی موت نہ مار دیا گیا۔ کچھ دور آگے جا کر راستہ میں ایک گدھے کی لاش سڑتی ہوئی نظر آئی، حضورؐ رک گئے اور ان دونوں اصحاب کو بلا کر فرمایا "اتریے اور اس گدھے کی لاش تناول فرمائیے"۔ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ اسے کون کھائے گا؟ فرمایا فما نلتما من عرض اخیکما انفا اشد من اکل منہ۔ ابھی ابھی آپ لوگ اپنے بھائی کی عزت پر جو حرف زنی کر رہے تھے وہ اس گدھے کی لاش کھانے سے بہت زیادہ بری تھی (ابوداؤد۔ کتاب الحدود

با یہم ماعز) اس واقعہ میں صاحب شریعت علیہ السلام نے خود حرمت کی صراحت فرمائی ہے، حالانکہ اس میں غیبت محرمہ کی وہ دونوں شرطیں غائب ہیں جو مذکورہ بالا تعریف میں بیان ہوئی ہیں۔ دونوں صاحبوں کی جو گفتگو روایت میں منقول ہوئی ہے اس کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ ان کی نیت حضرت ماعز کی تحقیر و تذلیل کی نہ تھی بلکہ وہ اس بات پر اظہار افسوس کرنا چاہتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے جرم پر پردہ ڈال دیا تھا تو انھوں نے کیوں بار بار اصرار کر کے اقرار جرم کیا اور رجم کی ہولناک سزا میں جان دی۔ رہی اخفا کی خواہش و کوشش تو اس کا یہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جس شخص کا ذکر کیا جا رہا تھا وہ دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔"

یہ طویل اقتباس میں نے اس لیے نقل کیا ہے کہ مجھے اس کے اندر سے ذہانت، خوش مذاقی، تعمق فی الدین، وسعت نظر اور حسن استنباط کے بہت سے شاہکار قارئین کے سامنے پیش کرنے ہیں تاکہ قارئین اچھی طرح اندازہ کر سکیں کہ "ذاتی بغض و عناد" کے سبب سے دینی مسائل میں کھینچ تان راقم نے کی ہے یا وہ لوگ کر رہے ہیں جو حکمت عملی کے تحت شریعت کے حرام کو حلال کر دینے کے قائل ہیں۔

(باقی آئندہ)

میثاق
کے
ہندوستانی خریدار اپنے چندے
الفرقان لکھنؤ
یا
دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ
کے پاس جمع کرائیں اور اس کی اطلاع ہمیں دیں

منیجر میثاق، رحمان پورہ، اچھرہ، لاہور

شذرات

میثاق سے متعلق بعض ضروری باتیں اس کے قارئین اور خریداروں تک پہنچانے کی ضرورت اس کی ابتدائے اشاعت ہی سے محسوس ہو رہی ہے لیکن اس کے صفحات میں ان متفرق باتوں کے کہنے کے لیے کوئی موزوں جگہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس شمارے کے یہ دو صفحے ہم نے مشکل اسی مقصد کے لیے بچائے ہیں کہ یہ متفرق باتیں کہہ دیں۔

ہمیں پاکستان اور بھارت کے متعدد اہل علم کے خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں اصرار کے ساتھ اس خواہش کا اظہار کیا گیا ہے کہ رسالے میں استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے افادات کی اشاعت کے لیے ایک باب مخصوص کر دیا جائے۔ بعض اہل علم نے اس کام کے لیے نقشہ بھی مرتب کر کے ہمیں بھیجا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے معارف کی اشاعت اس رسالے کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے اس وجہ سے لوگوں کے اس مطالبہ کو ہم بالکل صحیح سمجھتے ہیں۔ یہ باب جلد تاخیر قائم کر دیا جاتا لیکن اس وقت رسالے میں جو مضامین چل رہے ہیں ان میں سے کسی کے سلسلہ کو بیچ میں سے توڑ دینا ناموزوں ہوگا۔ مزید صفحات کا اضافہ فی الحال ہمارے لیے مشکل ہے۔ میثاق جس کاغذ پر چھپ رہا ہے یہ خاصا گراں ہے۔ اخباری کاغذ ابھی معلوم نہیں اس کو کب تک حاصل ہو سکے۔ ہم نے محض اس خیال سے کہ تھوڑے صفحات میں زیادہ مواد سما سکے پچھلے شمارے میں خط کسی قدر خفی کرا دیا تھا لیکن رسالے کے عام قارئین بالخصوص خواتین کا طبقہ اس پر راضی نہیں ہے۔ ان مجبوریوں کے سبب سے اس کے سوا چارہ نہیں کہ "افادات فراہیؒ" کے باب کے اضافہ کے لیے قارئین کچھ دنوں اور صبر کریں۔ غالباً نومبر تک "اسلامی قانون" کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد "افادات فراہیؒ" کا باب اس کی جگہ لے لے گا۔

بہت سے لوگوں نے جواب طلب مراسلے بھیجے ہیں جن کے جوابات وہ "میثاق" کے صفحات میں چاہتے ہیں۔ تبصرہ کے لیے کتابیں اور رسائل بھی آئے ہوئے پڑے ہیں اور بھیجنے والے حضرات ان پر تبصرے کے لیے مشغول ہیں۔ "تقریظ و تنقید" کا باب تو توقع ہے کہ اگلے پرچے میں قائم ہو جائے گا لیکن "مراسلہ و مذاکرہ" کا باب اکتوبر سے پہلے قائم ہونے کی توقع نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے نہ تو میں سوالات کے جواب لکھنے کی فرصت نکال سکتا

اور نہ رسالہ اپنے اندر ان کے لیے گنجائش پیدا کر سکتا۔

بعض دوستوں کی یہ رائے ہے کہ میرے سفر حج کی جو روداد میثاق میں شائع ہو رہی ہے اس کا میثاق کے صفحات میں بیچ میں سے شروع کرنا صحیح نہیں ہوا ہے۔ اس کی وہ قسطیں بھی میثاق میں شائع ہونی چاہئیں جو "المنبر" (لائلپور) میں نکل چکی ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ یہ سلسلہ جس طرح چل رہا ہے احباب اسی طرح اس کو چلنے دیں۔ اگر پچھلی اقساط کی اشاعت "میثاق" کے صفحات میں ضروری ہی سمجھی گئی تو اس سلسلہ کے اختتام پر پہنچ جانے کے بعد وہ قسطیں بھی شائع کر دی جائیں گی۔ جو لوگ المنبر پڑھتے رہے ہیں وہ تازہ اقساط کے خواہشمند ہیں اور جو لوگ اس کو نہیں پڑھتے رہے ہیں وہ نئی اقساط کے ساتھ پچھلی اقساط کے لیے بھی تقاضا کر رہے ہیں۔ ان دونوں خواہشوں کے درمیان توفیق کی یہی شکل سمجھ میں آئی ہے۔

بہت سے مخلصین نے اپنے خطوط میں اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ بھارت اور پاکستان کے بعض رسائل نے اس وقت میری ذات کو جو اپنے سب وشتم کا نشانہ بنا لیا ہے میں ان کا کوئی نوٹس نہ لوں۔ احباب مطمئن رہیں کہ نہ میں میثاق کے صفحات کو اتنا ارزاں سمجھتا کہ ان میں ہر شخص کی باتوں کا جواب دیا جائے اور نہ اپنی ذات کو اتنی قیمتی سمجھتا کہ ہر حملہ کا لازماً مقابلہ ہی کروں۔ میں ان لوگوں کی چیزیں بہت ہی کم پڑھتا ہوں جو بقول چراغ حسن حسرت مرحوم کے "لکھے زیادہ اور پڑھے کم" ہوتے ہیں۔ بعض لوگ مرحوم جماعت اسلامی کے سرپرستوں میں رہے ہیں۔ ان لوگوں کی سرپرستی کو بڑا دخل ہے اس جماعت کو اس انجام تک پہنچانے میں جس انجام تک بالآخر وہ پہنچی۔ ان حضرات کو سرپرستی کا یہ مقام ان کی کسی واقعی خدمت کے صلہ میں نہیں حاصل ہوا تھا، بلکہ صرف جماعت کے لیڈروں کی مداحی اور ان کے نقادوں کو گالیاں دینے کے صلہ میں انھوں نے یہ مقام حاصل کیا تھا۔ کوئی صاحب جماعت کے لیڈروں کو غزالیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کا درجہ دیتے رہے ہیں اور کوئی صاحب ابراہیم ادہمؒ اور بایزید بسطامیؒ کا لیکن یہ سب کچھ صرف زبانی جمع خرچ کی حد تک رہا ہے ان کی حکمت عملی نے کبھی اس سے آگے قدم بڑھانے کی انھیں اجازت نہیں دی۔ اس طرح یہ حضرات اپنے گھر بیٹھے بیٹھے اپنی اسی تشریح سے لیڈروں کو سرمست اور پیروؤں کو بیوقوف بنا کر اپنے رسالوں کے ذریعے سے اقامت دین کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے تو اپنی انھی خدمات جلیلہ کے صلہ میں یہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ بھارت سے بیٹھے بیٹھے یہ پاکستان کی مرحوم جماعت اسلامی کو بتاتے تھے کہ کب اس کے لیے سجدے کا وقت ہے اور کب قیام کا۔ آں محترم کے نزدیک یہ وقت مرحوم جماعت کے لیے قیام کا تھا، اب اتنی دور سے ان سے کون پوچھے کہ حضرت آپ نے تو قیام کا مشورہ دیا تھا لیکن اب جماعت وقت کے الہ کے آگے اوندھے منہ گری ہوئی جو پڑی ہے تو اس کو اٹھائے گا کون؟